ڈوبتے سورج کا
عابد ضمیر

عابد ضمیر

کا کرب

(مغربی بنگال)

عابد جعفر

ناشر :- محمد نظام الدین پکّا بازار آسنسول

طابع :- اختر حسین مرزا غالب روڈ آسنسول

اشاعت :- فروری سنہ ۱۹۸۱ء

خوشنویس کے اور سرورق :- مضطر عظیم آبادی بیوٹی آرٹ پریس آسنسول

قیمت عام ایڈیشن :- مبلغ دس روپے

ڈیلکس ایڈیشن :- مبلغ پندرہ ۱۵ روپے

ملنے کے پتے :

جاوید بکڈپو مولانا شوکت علی روڈ، کلکتہ ۲

شاداب بک ڈپو بسٹن بازار، آسنسول

نکہت بکڈپو اے۔بی۔ مارکیٹ، آسنسول

تاج بک ڈپو مین روڈ، رانچی

حسین بکڈپو دھنباد اسٹیشن، دھنباد

برادرِ مکرّم

جناب

ایس، ایم جمال الدین کے نام

جن کی شفقت اور محبت نے مجھے قدم قدم پر

چلنے کا حوصلہ بخشا۔

ترتیب

اظہارِ خیال

میرا جو تعلق خاطر شاعری اور شاعری کی تنقید کے ساتھ ہے وہ افسانے کے ساتھ نہیں۔ افسانے کا میرا مطالعہ بھی کم ہے۔ اس لئے افسانے کو جب میں پرکھتا ہوں تو بالکل سیدھے سادے معیار پر یعنی مجھے یہ پسند ہے یا نہیں۔ اگر اس نے مجھے متاثر کیا تو کس حد تک۔ اس سے آگے تجزیئے کی گہرائیوں میں نہیں جاتا۔ چنانچہ مجھے افسانوں یا ناولوں کے مطابق جب کچھ لکھنے کو کہا جاتا ہے تو مجھے اس میں تامل ہوتا ہے اور یہی تامل اس وقت بھی تھا جب قیام انیس صاحب نے مجھے عابد ضمیر کے افسانوں کا مجموعہ اظہار خیال کے لئے بھیجا لیکن میں انکار نہ کر سکا چنانچہ اس مجموعے کو میں نے اول سے آخر تک پڑھا اور میرے وجدان کو اس میں وہ کیفیت نظر آئی جس کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آج کہانی میں کہانی پن ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے میری عمر کے لوگوں کے لئے کہانی میں دلچسپی کا عنصر آہستہ آہستہ مفقود ہو رہا ہے۔ لیکن عابد ضمیر کی کہانیوں کا مسودہ دیکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گم گشتہ متاع ہاتھ آگئی ہو میں عابد ضمیر کو ان کہانیوں کی تخلیق پر مبارکباد دیتا ہوں اور اس تخلیق کو اردو کے افسانوی ادب کے لئے نیک فال سمجھتا ہوں۔

جگن ناتھ آزاد

صدر شعبۂ اردو - جموں یونیورسٹی جموں (جموں اور کشمیر)

Mujtaba Hussain
85/29
Malvia Nagar
New Delhi - 110017

برادرم عابد ضمیر صاحب

السلام علیکم!

.... آپکے افسانے پڑھے ہیں۔ آپ اور آپ کے احباب نے مغربی بنگال میں جس طرح اردو شعر و ادب کے ماحول کو زندہ اور تابندہ رکھا ہے اس کے لئے آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپکے افسانوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔

یقیناً ادبی حلقوں میں اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کاش کہ میں اس کتاب کے جلسہ رونمائی میں حاضر ہوتا۔ تاہم میری ساری نیک تمنائیں آپکے ساتھ ہیں۔ ایک عجیب بات ہے کہ میں نے ہندوستان کے سارے شہر دیکھ ڈالے، ساری ریاستوں میں گیا ہوں مگر کبھی کلکتہ اور مغربی بنگال آنے کا موقع نہیں ملا۔ اب آپنے اتنی محبت سے مجھے مغربی بنگال آنے کی دعوت دی ہے تو پھر حالات دیوار بن گئے ہیں۔ زندگی باقی رہی تو کبھی آسنسول ضرور آؤں گا.........

مخلص

مجتبیٰ حسین

عابد ضمیر

فکر و فن کے آئینے میں

اردو کی جنم بھومی پنجاب ہو یا دکن، دلی ہو یا آگرہ، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اردو زبان و ادب کے نشو و نما میں دلی کا اہم حصہ رہا ہے۔ مگر مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہاں کی ادبی محفلیں بھی اجڑ گئیں اور لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد میں شعر و شاعری کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو نثر کے ارتقا کے لئے ایک نیا باب کھولا اور اس طرح بنگال میں کلکتہ، مرشد آباد، مٹیا برج ہگلی، سیرامپور، مدنی پور، پنڈوا اور جہانگیر نگر ادبی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے۔ کچھ دنوں پہلے تک یہ غلط فہمی عام تھی کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو زبان و ادب کے ارتقا میں بنگال کا قابل ذکر حصہ نہیں رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی زبان و ادب کی تاریخ لکھی گئی اس خطے کے لسانی کارناموں اور ادبی جواہر پاروں کی نمائندگی نہ ہو سکی۔

ملک کی آزادی کے بعد پورے ملک میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً انتشار، بے چینی اور دل شکستگی کی سی کیفیت چھائی رہی۔ ساحل آزادی تک پہنچنے کے لئے آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑا۔ صرف اس ریاست ہی کے دو حصے نہیں ہو گئے بلکہ خاندان تقسیم ہو گئے اور گھروں کا بٹوارہ ہو گیا۔ مگر یہ صورت حال بہت دنوں تک نہ رہی آہستہ آہستہ تقسیم کا زخم مندمل ہوتا گیا اور حالات سازگار ہونے لگے۔ معاشرتی اور سیاسی لحاظ کے ساتھ ساتھ ادبی فضا پر بھی اس کا اثر پڑا۔ شعر و شاعری کی محفلیں پھر آباد ہونے لگیں۔ اور علمی و ادبی کاموں کی طرف توجہ مبذول ہونے لگی۔ کلکتہ کے علاوہ آسنسول اور برن پور کے صنعتی علاقے میں بھی ادبی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید اور صحافت ہر میدان میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ کتابوں کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دی گئی اور اس طرح مغربی بنگال نے اردو

دنیا کے نقشے میں اپنے مقام کے تعین کی کوشش کی۔ اس صنعتی علاقے میں آزادی کے بعد ابھرنے والے فنکاروں میں ایک باوقار نام عابد ضمیر کا ہے۔

عابد ضمیر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور جلد ہی ملک کے مختلف جرائد میں چھپنے لگے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کا انداز بیانیہ ہے کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں قاری کے لئے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت بے باکی اور جرأت سے اپنی فکری وفنی کاوشوں کو پیش کیا ہے۔ وہ افسانے کی مختلف کڑیوں اور واقعہ کی ڈوریوں کو الجھا نہیں چھوڑتے بلکہ سلجھاتے جاتے ہیں۔

۲۰ ویں صدی کی چھٹی دہائی کے آس پاس افسانوں میں فکری وفنی سطح پر انحراف کی شکل واضح ہونے لگی۔ پرانی قدروں کی شکست وریخت، معاشی پریشانی، طبقاتی کشمکش، ذات کا بحران اور تنہائی کا خوف نئے افسانوں میں فکری وفنی اظہار کے طریقے میں تبدیلی کے باعث ہوئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس رجحان میں کافی شدت آگئی اور بیشتر افسانے محض منفی احساس و فکر کے ترجمان بنکر رہ گئے۔ عابد ضمیر نے بھی بدلتے ہوئے حالات کا اثر قبول کیا ہے لیکن ان کا رویہ منفی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں قتل و غارت، غلاظت و عفونت اور مار دھاڑ کی فضا نہیں ملتی بلکہ زندگی کے مثبت عناصر کی فنکارانہ عقدہ کشائی ہے۔ اور ان میں ذاتی درد کے ساتھ ساتھ اجتماعی کرب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

عابد ضمیر کے افسانوں کی زبان سادہ ہے اور بیان میں پیچیدگی نہیں۔ وہ اپنی بات دو ٹوک کہنے کے عادی ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کے کرداروں سے اپنی کہانیوں کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی جاندار اور پائیدار روایت سے اپنے فن کا چراغ جلاتے ہیں اور خلوص و صداقت کیساتھ زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ نئے افسانوں میں گاؤں کی سیدھی سادی اور پر خلوص زندگی کی تصویر بھی ملتی ہیں اور شہروں کے مشینی اور پُر فریب زندگی کے مرقعے بھی۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اسلئے زندگی کی تصویریں صاف اور واضح ہیں اور کہیں جھول نظر نہیں آتا۔

انکے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

علقمہ شبلی ۱۰ جنوری ۱۹۸۱ء

"ڈوبتے سورج کا کرب"

ہمارے ماحول کی اہم صداقتیں

احسن مفتاحی

افسانے کو حالات کا عکاس اور عصری آگہی کا مظہر ہونا چاہئے۔ افسانے پر کچھ لکھتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ زیرِ نظر افسانہ زندگی کی ترجمانی، نقوشِ زندگی یا زندگی کی تصویر پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہے؟ میں کوئی مستند ادیب یا عالم نہیں ہوں کہ افسانوی ادب پر سیر حاصل بحث کروں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ افسانہ زندگی کا ادبی نقش ہے۔ اردو میں افسانہ نگاری کی عمر کوئی بہت طویل نہیں ہے۔ یہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور ابتدائی افسانہ نگاروں میں سب سے نمایاں نام منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے نظر آتے ہیں۔ ہمارے افسانوی ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو شروع ہی میں دو ایسے فنکار مل گئے جنہوں نے اس کو بامِ عروج پر پہنچا دیا اور ہم فخر کے ساتھ عالمی ادب کے سامنے اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں۔ پریم چند نے جس دنیا کو دیکھا تھا اس کو یلدرم اور ان کے ساتھیوں نے نہیں دیکھا۔ ہندوستان کی اصلی زندگی دیہات میں تھی، ان پڑھ لوگوں میں تھی، پریم چند کے افسانوں میں اسی زندگی کی عکاسی تھی۔ اس کے برعکس یلدرم کا تصور اعلیٰ طبقے تک محدود تھا جو مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔

اردو افسانے کی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونا چاہئے کہ اس میں اپنے دور کی اہم صداقتیں موجود ہوں۔ اس اعتبار سے آزادی سے پہلے افسانہ لکھنا بڑا مشکل امر تھا اس لئے کہ اس زمانے میں افسانہ نگار کو ماحول کی عکاسی، حالات کی ترجمانی اور صورت حال کی غمازی کے علاوہ استعماریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہوتی تھی مگر آزادی کے بعد یہ مشکل ترین امر آسان ہو گیا کہ اب ہمیں استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے لئے صدائے احتجاج بلند کرنا نہیں پڑتی بلکہ صرف اپنے گرد و پیش کے مشاہدے کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو افسانہ نگاری کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء کے بعد بہت کم ایسے افسانہ نگار ملیں گے جو عصری زندگی کے نئے تقاضوں سے متاثر نہ ہوں۔

کرشن چندر، بیدی، اشک، اختر رائے پوری، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، منٹو، رشید جہاں، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، ممتاز مفتی، آغا بابر، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، بلونت سنگھ، انتظار حسین، مہندر ناتھ، دیویندر ستیارتھی، حسن عسکری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اس فن کو سربلند کیا۔

افسانوی ادب میں شعری ادب کی طرح پرانی اور نئی نسل کی کوئی ناخوشگوار بحث نہیں ہے۔ اس لئے ۱۹۶۰ء کے بعد جو نئے لکھنے والے ابھرے ہیں ان میں عابد ضمیر کا نام آسانی سے لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں کے لئے مواد تلاش کرنے میں بڑی جاں فشانی اور محنت کی ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو ہمارے ماحول سے آشنا کر رہے ہیں۔

عابد ضمیر کے افسانوں میں ہمارے عہد کی اہم صداقتیں اور ماحول کی عکاسی ہے۔ ان میں "تمک کا بوجھ" "اپنا گھر" "ڈوبتے سورج کا کرب" "آواز کا کرب" "رِستے آنسو" اور "دل کا داغ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں زبان بھی بڑی شستہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ "ڈوبتے سورج کا کرب" قبولیت عام کا درجہ حاصل کرے گا۔

عرضِ حال

ایک افسانہ نگار جن واقعات یا حادثات سے دوچار ہوتا ہے انہیں افسانوی شکل میں وہ اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا افسانہ ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں کبھی کبھی قاری کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے اور افسانہ پڑھتے وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اسی کے دل کی بات ہے اور اس حادثے کا تعلق اسی کی ذات سے ہے!

میرے افسانے ۱۹۵۶ء سے ہی ملک کے مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ میری نگاہوں میں مفروضہ اور روایتی افسانوں کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ انہی باتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جن سے میں خود دوچار ہوا۔ جو حقیقت سے قریب تھیں۔

”ڈوبتے سورج کا کرب“ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں اکثر افسانے حقیقت سے بہت قریب ہیں۔ جانکی کا کردار آج بھی لوگوں کو انسانیت کا درس دے رہا ہے۔ میں ادب میں پرانی قدروں کے ساتھ نئے رجحانات سے بھی ہم آہنگ ہونا ضروری سمجھتا ہوں لیکن صرف اسی حد تک کہ جو بات کہی جائے وہ قاری کی سمجھ میں بھی آجائے۔ مسائل و مصائب کی اس دنیا میں آج ہر شخص اپنے شانے پر ایک بھاری بوجھ لئے ہوئے گھوم رہا ہے اور اپنی ذات کے کرب میں مبتلا ہے۔

ایک افسانہ نگار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے قاری کو الفاظ کے سمندر میں ہی ہاتھ پاؤں مارنے کیلئے نہ چھوڑ دے بلکہ انکے مسائل کی نشاندہی کرکے انکا حل تلاش کرنے کی بھی کوشش کرے۔ میں نے اپنے افسانوں میں ہمیشہ یہی بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اب یہ تو آپ ہی بہتر جانتے ہیں کہ میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوں۔

میں اپنے ان کرمفرماؤں کا بیحد ممنون ہوں جنھوں نے میرے افسانوں کے متعلق اپنی قیمتی رائے سے نواز کر مجھ ناچیز کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس سلسلے میں اگر میں خاص طور سے اپنے عزیز ترین شاگرد اختر حسین اور محمد نظام الدین کا شکریہ ادا نہ کروں تو سخت ناانصافی ہوگی کیونکہ انکے تعاون کے بغیر اس مجموعے کا چھپنا مشکل تھا۔ لیکن جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ انکا جذبۂ خلوص ہے جو اندھیرے میں ہمیشہ ایک کرن کی طرح جگمگاتا رہے گا۔

عابد ضمیر — آسنسول ۱۱ر فروری ۱۹۸۱ء

(۱۱)

بائیس سال بعد اچانک وقت نے بے رحم حالات کے اسٹیج پر اُس درد فرسا واقعہ کو دہرا دیا تھا جس کی یاد خان صاحب وزیر احمد کے سینے میں ناسور بنکر رِس رہی تھی۔

خان صاحب نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے آنکھوں پر سے عینک اتاری اور کُرتے کے میلے دامن سے شیشوں کو صاف کر کے پھر آنکھوں پر چڑھالی۔ انہیں ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ کھُلے ہوئے دریچے سے ہوا کا تیز جھونکا اُنکے بہکے ہوئے خیالات کی طرح کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور دیوار پر آویزاں کلینڈر کے اوراق زور زور سے پھڑپھڑانے لگے۔ یکا یک انہوں نے اپنے آپکو ماضی کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوا محسوس کیا جہاں دور دور تک نہ کوئی سبزہ تھا اور نہ کوئی رنگینی تھی۔ ہر طرف مایوسیوں کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔

اُن کی والدہ حمیدہ بیگم سخت مزاج کی تھیں۔ انہوں نے کچھ اصول بنائے تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہا کرتی تھیں۔ اور جب وہ اُن اصولوں کی خلاف ورزی ہوتے دیکھتی تھیں تو چیخ چیخ کر سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ ہر طرف افراتفری سی مچ جاتی اور گھر میں چھوٹا موٹا ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اُن کے مزاج کی یہ سختی جھنجھلاہٹ اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بات بات پر ٹوکنا اور چھوٹی سی غلطی پر سخت سُست کہنا اُنکی عادت بنگئی تھی۔ بیٹی جو خوشی کے چار دن گزارنے میکہ آتی تھی اُن کی تنک مزاجی اور سختیوں سے بددل ہو کر وقت سے پہلے ہی سسرال چلی جایا کرتی تھی۔ جب اپنی بیٹی کے ساتھ ان کا ایسا برتاؤ تھا تو بہو تو پھر بہو ٹھہری! وہ ہر وقت اُس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔

دال میں نمک کیوں کم ہے؟ سالن میں اتنا تیل کیوں ڈالدیا؟ کیا تیرے باپ کے یہاں سے تیل کا کنستر آتا ہے؟
چاول میں کنکر کیوں رہ گیا؟ کیا چنتے وقت دیدے پھوٹ گئے تھے ——؟

والدہ کے یہ جملے سن سن کر خود وزیر احمد کا ناک میں دم آ گیا تھا مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ وہ ضعیف والدہ کو چھوڑ بھی تو نہیں سکتے تھے۔ اور اپنی خاندانی روایات کیمطابق بیوی کو لیکر الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کیلئے جینا اور مرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن انکی بیوی کلثوم فطرتاً نیک مزاج کی تھی۔ وہ ساس کی سختیوں اور جھڑکیوں کے باوجود ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی اور ان کے زہر میں بجھے ہوئے جملوں کو امرت سمجھ کر پی لیتی تھی۔

لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

کچھ دنوں سے اُن کا چڑچڑا پن بہت بڑھ گیا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ انور پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ اسکی شرارتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ کبھی دادی کی عینک چھپا دیتا اور کبھی وہ سوئی ہوتیں تو اُن کے کانوں میں زور سے سیٹی بجا کر بھاگ جاتا۔ وہ سمجھتیں کہ یہ سب کلثوم کا سکھایا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر وہ کلثوم اور انور دونوں کو کوسنے لگتیں۔ اور جب کبھی انور ان کے ہاتھ آ جاتا تو اسے پیٹنے لگتیں۔ یہ دیکھ کر کلثوم تڑپ اٹھتی اور انور کو ان سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی۔ پھر دونوں طرف مورچے سنبھال لئے جاتے۔ اس دن گھر میں خاصہ ہنگامہ ہو جاتا۔ کھانا پکتا لیکن کوئی کھاتا نہ تھا۔ اور دوسرے دن سارا کھانا ٹب میں ڈال دیا جاتا۔ وزیر احمد ہر ایسے موقع پر اپنی بیوی ہی پر بگڑتے اور اسے سمجھایا کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ زیادتی ان کی والدہ ہی کی ہے۔ لیکن وہ مجبور اور بے بس تھے۔ وہ اپنے اس خاندانی نظریے کا احترام کرتے تھے کہ بیویاں تو بہت ملینگی' ماں نہیں ملے گی! اس لئے یہ جانتے ہوئے کہ گھر میں ہونے والے ہنگاموں میں کلثوم کا ہاتھ نہیں' وہ ایسے موقعوں پر اُسی کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا کرتے۔ کلثوم ان ساری باتوں کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن آخر ایک دن اُس کے ضبط کی ساری حدیں سمٹ گئیں اور وہ باغیانہ انداز میں چیخ اٹھی۔

انور کا پورا چہرہ خون سے تر تھا۔ اُس کی پیشانی پر تازہ زخم تھا جس سے خون رس رس کر اُس کے چہرے اور قمیص کے دامن کو سرخ کر رہا تھا۔

"دادی نے مارا ـــــ دادی نے مارا ـــــ" وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا

کلثوم نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے جلدی سے انور کو گود میں اٹھالیا اور ساس کی طرف جھپٹی ــــــ

"اب کیا اسے مار ہی کر دم لیجیئے گا؟ گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتیں!؟"

"بہو! ذرا سی بات پر اس طرح واویلا کیوں مچاتی ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ آج تم نے مجھے گھر سے نکلوانے کا فیصلہ کر لیا ہے ــــــ!"

"امّی! کچھ تو خدا سے ڈریئے۔ ایک تو معصوم کو لہو لہان کیا اور اُلٹا مجھ ہی پر تہمت بھی لگاتی ہیں!"

"تو کیا تو بھی مجھے مارے گی؟ ہائے مار ــــ نکال لے اپنے دل کے ارمان ــــ یہی دن دیکھنے کے لیے میں آج تک زندہ رہی ــــ!"

حمیدہ بیگم چیخ چیخ کر اپنے سر کے بال نوچنے لگیں۔

وزیر احمد دکان بند کر کے گھر کھانا کھانے کیلئے آئے تھے۔ گھر کا نقشہ دیکھ کر انہیں اس ماحول سے نفرت سی ہو گئی۔ کلثوم حیران و پریشان مجسم حزن و ملال بنی کھڑی تھی اور انور کے زخم اور چہرے پر خون جما تھا۔

"یہ سب کیا ہے ــــ!؟" وزیر احمد فرطِ غم سے چیخ اٹھے۔

"آج تیری بیوی مجھے گھر سے نکلوانے پر تلی ہوئی ہے" حمیدہ بیگم نے روتے ہوئے کہا

"نہیں ــــ آج میں خود اس گھر سے ہمیشہ کیلئے جا رہی ہوں۔ اب میں ایک لمحہ بھی اس ماحول میں سانس نہیں لے سکتی۔" کلثوم نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کلثوم! پاگل نہ بنو ــــ!" وزیر احمد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب کسی کی آواز میرے فیصلے کو نہیں بدل سکتی۔" کلثوم نے وزیر احمد کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن تم انور کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں!" یکایک وزیر احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں خود اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے نہ دیکھ سکوں گی۔ کاش! میری عمر بھی اسے لگ جائے۔"

کلثوم نے سوگوار لہجے میں کہا۔

"کلثوم! میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہیں روک سکتا ہوں اور روک بھی رہا ہوں۔ لیکن تم اپنی مرضی سے جا رہی ہو پھر بھی اس گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے تم جب چاہو آ سکتی ہو!"

وزیر احمد نے کلثوم کی طرف دیکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

کلثوم نے انور کو سینے سے بھینچ کر پیار کیا اور اسکی پیشانی کو چوم کر اسے وزیر احمد کے بازوؤں میں دے دیا۔ اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"بہو! رک جاؤ ورنہ پچھتاؤ گی!" حمیدہ بیگم نے نرم لہجے میں تنبیہ کی۔

"کلثوم! رک جاؤ۔ پاگل نہ بنو!"

وزیر احمد کلثوم کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

"نہیں، اب میں اس جہنم میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ!"

کلثوم چلی گئی۔ اور ماں کے بنائے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر وزیر احمد نے پیار کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ گر گئی۔ وزیر احمد کا دل خون ہو گیا اور نگاہوں کے سامنے ہر طرف مایوسیوں کے بھیانک سائے پھیل گئے۔

"ماں ۔۔۔!"

انور کی چیخ سن کر وزیر احمد یکبارگی چونک اٹھے۔ انہوں نے اسے اپنے بیتاب سینے سے بھینچ لیا اور ایک پاگل کی طرح سامنے کھڑی والدہ کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ وزیر احمد کے سر پر رکھ دیا اور گھٹے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"بیٹا! میں نہیں جانتی تھی کہ چھوٹی موٹی باتیں ایک دن ایسا بھیانک روپ دھار لیں گی۔ میں باعث ہوں بہو نے میری وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ تو جا اور اُسے منا کر لے آ۔ میرا کیا ہے، کسی کے یہاں بھی زندگی کے باقی دن کاٹ لوں گی ——!"

"امّی! آپ فکر نہ کیجیے۔ انور ہمارے پاس ہے۔ چند دنوں میں کلثوم کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ خود ہی آ جائے گی۔۔"

وزیر احمد نے پُر امید لہجے میں کہا۔ لیکن کلثوم کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ حمیدہ بیگم بہو! بہو! پکارتی ہوئی آخرت کو سدھار گئیں۔ لیکن کلثوم نہ آئی۔ اس کی انا کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دو چار دنوں کے بعد وزیر احمد آ کر اُسے لے جائیں گے۔ لیکن وزیر احمد ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ کلثوم اپنی مرضی سے گئی ہے اس لئے اُسے خود ہی آ جانا چاہیے۔

ماں کے مرنے کے بعد وزیر احمد کو گھر جیسے کاٹنے لگا۔ دوستوں نے انہیں دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ لیکن وزیر احمد کو کلثوم سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے ہر بار شادی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے انور کے آرام اور اُس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی جو گھر کا سارا کام بھی کرتی تھی۔ اس طرح بیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ نہ کلثوم اپنے میکے سے واپس آئی اور نہ وزیر احمد اُسے لینے گئے۔ کلثوم کی ایک بڑی سی تصویر وزیر احمد کی خواب گاہ میں لگی ہوئی تھی جسے دیکھ دیکھ کر انہوں نے جدائی کے بیس سال گزار دیے تھے۔ بیس سال کے اس طویل عرصہ میں انور بی۔ کام پاس کر کے ایک پرائیوٹ کمپنی میں ٹریولنگ ایجنٹ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی ہم جماعت افروز سے سیول میرج کر لی تھی۔ بیٹے کی اس من مانی سے وزیر احمد کے سینے میں ایک اور زخم ہو گیا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔ بیوی کے بعد وہ بیٹے کو بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ دل مسوس کر رہ گئے۔

افروز شہر کے ایک سرکاری افسر کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ قیمتی جہیز لائی تھی۔ وہ بے حد حسین بھی تھی۔

اس کے باوجود وزیر احمد اُسے پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ آزاد اور فیشن پرست ماحول کی پروردہ تھی اور پردے کو لعنت سمجھتی تھی۔ وہ بہت آزادی سے اپنے دوستوں سے ملا کرتی تھی۔ اُس کے دوستوں میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ کبھی کبھی وہ انہیں گھر پر بھی بلا لیا کرتی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ پکچر دیکھتی تھی اور روزانہ کلب بھی جاتی تھی۔

انور ٹریولنگ ایجنٹ تھا اور بزنس کے سلسلے میں اُسے اکثر باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی افروز کلب جایا کرتی تھی۔ وزیر احمد اُسے یہ سمجھا کر تھک چکے تھے کہ شادی کے بعد شوہر کا گھر اور اس کا آنگن ہی عورت کی دنیا ہوتی ہے۔ کلب کی دنیا ایک سراب ہے۔ غلط راستے پر اٹھا ہوا قدم انسان کو تباہی کے غار میں گرا دیتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کا افروز پر اُلٹا اثر ہو رہا تھا۔ دن بدن اُس کی بے راہ روی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ رات بہت بھیانک تھی۔ آسمان پر ایک بھی ستارہ نہ تھا۔ ہر طرف خوفناک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کتے ڈراؤنے انداز میں بول اٹھتے تھے۔ انور بزنس ٹور پر گیا ہوا تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اور افروز ابھی تک کلب سے نہیں لوٹی تھی۔

وزیر احمد اپنی خوابگاہ میں کلثوم کی تصویر کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں تصویر سے کہہ رہے تھے۔

"کلثوم! تم تو سکھ کی سانس لے رہی ہو۔ لیکن زندگی کی خارزار راہوں پر چلتے چلتے مرے پاؤں لہولہان ہو گئے ہیں۔ اب میرے اندر ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی سکت نہیں۔

تم آخر اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہو؟ سب کچھ دیکھتی ہو پھر بھی ٹوکتی تک نہیں۔ میں اب اور ضبط نہیں کر سکتا۔ تم آج اپنی بہو کو اچھی طرح سمجھا دو تاکہ وہ صحیح راستے پر آجائے ورنہ اس گھر میں یا میں رہونگا یا وہ!"

وزیر احمد نے تصویر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ اُنکی آنکھوں سے آنسو گر گر کر دامن میں جذب

ہوتے جارہے تھے۔ یکایک گلی میں ایک ملا جلا قہقہہ گونج اٹھا جس میں نسوانی اور مردانی آواز شامل تھی۔

نسوانی آواز افروز کی تھی۔ وزیر احمد اٹھ کر آنگن میں آگئے۔ اسی وقت افروز نے دروازہ کھولنے کیلئے گھنٹی بجائی۔

ملازمہ سوئی ہوئی تھی۔ وزیر احمد نے خود ہی بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ان پر نظر پڑتے ہی افروز کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ نادم سی ہوکر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بہو! اتنی رات کو اکیلی کہاں سے آرہی ہو؟"

وزیر احمد نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"ایک سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں گئی تھی۔ اس کی ملازمہ یہاں تک پہنچا گئی ہے۔"

افروز نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"میں نے گلی میں قہقہوں کی آواز سنی تھی۔ ملازمہ کی آواز بہت بھاری تھی جیسے کسی مرد کی آواز ہو!"

وزیر احمد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپکو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں!" افروز کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"اور تمہیں یہ حق ہے کہ میری شرافت پر بٹہ لگادو میرے خاندانی وقار کو خاک میں ملاؤ؟"

وزیر احمد نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"آپ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔" افروز نے چیختے ہوئے کہا۔

"بہو شور نہ مچاؤ! یہ شریفوں کا گھر ہے۔"

وزیر احمد نے ضبط سے کام لیتے ہوئے گھٹے لہجے میں کہا۔

"تو کیا میں آوارہ ہوں؟ بدچلن ہوں۔" افروز چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"بہو! خدا کیلئے چپ ہو جاؤ۔"

یکایک وزیر احمد نرم پڑ گئے اور افروز اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی وقت دروازے پر انور نے آواز دی۔ وہ خلاف توقع اپنے پروگرام سے پہلے ہی واپس آگیا تھا۔ ملازمہ جاگ چکی تھی اور اس ہنگامہ کے دوران آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

انور جیسے ہی اندر داخل ہوا افروز کے کمرے سے شیشہ گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے ابو جان؟ خیریت تو ہے!؟"

انور نے باپ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہو ابھی تفریح کر کے باہر سے لوٹی ہیں اور ذرا سا ٹوکنے پر برہم ہو اٹھی ہیں۔"

وزیر احمد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا آپ آرام کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کیا بات ہے۔"

انور یہ کہتا ہوا افروز کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسکے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ کمرے کا سارا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا اور چینی کے بہت سے برتن ٹوٹے پڑے تھے۔

"افروز! یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔۔ !؟" یکایک انور چیخ اٹھا۔

"اپنے بوڑھے باپ سے جا کر پوچھو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جو خود گھر میں رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں اور میرے ذرا سی دیر سے لوٹنے پر مجھے آوارہ اور بد چلن کہتے ہیں۔"

افروز نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

"افروز ۔۔ !" اچانک انور نے افروز کے رخسار پر ایک زور دار طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی ذلیل اور اتنی کمینی ہو۔ یہ تمہارے کردار کی گراوٹ ہے کہ جس نے تمہیں بیٹی کا درجہ دیا اسی کے متعلق تم آج اس طرح زبان چلا رہی ہو!"

افروز کا خوبصورت چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے پھول جیسے رخسار پر انگلیوں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ وہ یکبارگی سسک اٹھی۔ اور انور بوکھلا گیا۔ وہ افروز سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

"افروز! مجھے معاف کر دو!"

انور نے افروز کے دونوں ہاتھ تھام کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"انور! پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم لوگ اتنے قدامت پرست ہو۔ میں صبح ہی ڈیڈی کے یہاں چلی جاؤں گی" افروز نے سسکتے ہوئے کہا۔

"افروز! خدارا ایسا نہ کرنا ورنہ آج سے بائیس سال پہلے اس گھر میں حالات نے جو ڈرامہ کھیلا تھا تاریخ پھر اُسے دہرا دے گی۔ اس بار صرف اسکے کردار نئے ہونگے!" انور نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اب گھر کے اس پنجرے میں نہیں رہ سکتی!"

افروز کی سسکیاں پھر ابھرنے لگیں۔ اور کلثوم کی تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے وزیر احمد کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بائیس سال پہلے کھیلا ہوا ڈرامہ آج پھر اس گھر میں کھیلا جائے جس نے اُن کی پیار بھری دنیا میں آگ لگا دی تھی اور اُن کی ہر خوشی کو خاکستر کر دیا تھا۔ انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔ اور جب وہ آئی تو اسکے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے کہا ــــــ

"سنو، میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ صبح جب انور اٹھیں تو میرا یہ خط انہیں دے دینا!"

ملازمہ کے کچھ دریافت کرنے سے پہلے وزیر احمد دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

افروز کے کمرے میں اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں گونجتی رہیں اور انور ساری رات بے چین رہا۔ گلی میں کتے ڈراؤنی آواز میں روتے رہے۔

صبح افروز جیسے ہی ہاتھ میں سوٹ کیس تھام کر گھر سے نکلنے لگی ملازمہ نے انور کے ہاتھ میں اُسکے والد کا خط تھما دیا۔ انور نے خط پڑھ کر افروز کی طرف بڑھا دیا جس میں لکھا تھا ـــ "میں خودکشی کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ تم دونوں میرے لوٹنے تک میرا انتظار کرو ......!" نہ جانے اس مختصر سی تحریر میں کیا جادو تھا کہ افروز کے اٹھے ہوئے قدم رُک گئے۔ شاید یہ خط کا نفسیاتی اثر تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسکی

سرکشی پھر لوٹ آئی اور اُس نے باغیانہ انداز میں ہاتھ میں سوٹ کیس تھام لیا۔

"افروز! پاگل نہ بنو۔ جلدی میں اٹھایا ہوا قدم غلط ہوتا ہے!"

انور نے بےچین ہو کر افروز کا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن اُس نے تیزی سے انور کا ہاتھ جھٹک دیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"افروز! خدا کے لئے رُک جاؤ۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔" انور نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

"میں اس گھر کی مالکہ ہوں، ملازمہ نہیں، میرے ڈیڈی ایک سرکاری افسر ہیں اور میں جہیز میں دس ہزار روپے نقد لائی ہوں۔ تمہارے والد نے میری توہین کی ہے۔ وہ جب تک مجھ سے معافی نہیں مانگیں گے اس وقت تک میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی!"

افروز نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مالکن! مان جائیے ______"

بوڑھی ملازمہ نے اُس کا سوٹ کیس تھامتے ہوئے کہا۔ لیکن اس نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

انور کٹی ہوئی شاخ کی طرح آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے ہو کر افروز ہمیشہ کے لئے اس گھر سے چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ چائے تیار کر کے لے آئی۔ لیکن انور نے چائے پینے سے انکار کر دیا اور ویران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکایک کھلے ہوئے دروازے سے اُسکے والد وزیر احمد داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے اُس کی ماں کلثوم تھی!

انور یہ دیکھ کر چونک اٹھا۔ یوں تو وہ ہمیشہ اُن کی تصویر اپنے والد کی خوابگاہ میں دیکھا کرتا تھا

لیکن آج جب اس نے انہیں مجسم اپنے سامنے دیکھا تو اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"امی ــــ!" وہ اٹھ کر بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

"ابھی تک تیری شرارت نہیں گئی؟ تو جانتا تھا کہ میں آرہی ہوں۔ اس لئے تو نے دلہن کو کہیں چھپا دیا بتا دلہن کہاں ہے؟ میں اسکی بلائیں لے لوں۔ اُسے جی بھر کے پیار کر لوں۔ میں اسے بتا دوں کہ تیری ساس آگئی ہے، تیرے آنگن میں تیرے دلاروں کو کھلانے کے لئے۔"

کلثوم نے انور کو الگ کرتے ہوئے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ان کی بے چین نگاہیں افروز کو تلاش کرنے لگیں۔

"ماں! تم نے دیر کر دی۔ اب تم اُسے نہ دیکھ سکو گی۔ وہ اس گھر سے چلی گئی۔ ہمیشہ کے لئے۔" انور نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں ــــ" وزیر احمد اور کلثوم ایک ساتھ فرطِ غم سے چیخ اٹھے۔

"افروز نہیں جا سکتی۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ اسے منا کر لے آؤں گا۔" وزیر احمد نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں" کلثوم نے بے چین لہجے میں کہا۔

"نہیں ــــ آپ کو میری قسم، نہ جائیے۔ اگر آپ لوگ گئے تو واپس آکر مجھے زندہ نہ دیکھیں گے!"

"انور ــــ!" کلثوم نے بے چین ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

ماحول بے حد غمناک ہو گیا تھا اور وقت کی رفتار رک سی گئی تھی۔ فضا سوگوار تھی، اور سبھوں کے چہرے غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

اسی وقت عابدی صاحب افروز کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ افروز اس طرح اداس اور مضمحل تھی جیسے کوئی گلاب شاخ سے الگ ہو کر مرجھا گیا ہو۔

"افروز!" عابدی صاحب نے اپنی بیٹی کا بازو تھام کر بھاری آواز میں کہا۔

"یہی گھر اب تمہارا سب کچھ ہے۔ کس کے یہاں اَن بن نہیں ہوتی؟ زندگی میں چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس طرح کہیں کوئی اپنا گھر چھوڑا کرتا ہے؟ اپنے آنگن کی کیاریاں چھوڑتا ہے؟ اپنی مہکاروں سے دور ہو جاتا ہے؟"

کلثوم نے بڑھ کر افروز کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہو! میں بیس سال تک اس گھر کے لئے تڑپتی رہی ہوں۔ کاش! میں تمہیں بتا سکتی کہ اپنا گھر کیا ہوتا ہے ــــــ!!"

انور نے شرارت بھری نظروں سے افروز کی طرف دیکھا۔ اور افروز کا حسین چہرہ حیا کی لالی سے دمکنے لگا۔

•••

شاعر، بمبئی

شمارہ ۱۱ - جلد ۳۵

نومبر ۱۹۶۴ء

"ہیلو! سکس، ایٹ، ون ۔۔۔!"

ٹیلیفون کا ریسیور رما کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔

"ہیلو! پرنسپل اسپیکنگ"

دوسری طرف سے بی۔ جی۔ کالج کے پرنسپل نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ پرنسپل صاحب! آپ فوراً پروفیسر ساگر کو گھر بھیج دیں۔"

رما نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر رما وہ تو ۔۔۔ ہیلو ہیلو ۔۔۔"

لیکن رما نے زور سے ٹیلیفون کا ریسیور کریڈل پر پٹک دیا اور ہچکیاں لینے لگی۔ اس کے سامنے میز پر دو خط پڑے تھے۔ ایک کامنی کا، دوسرا ساگر کا۔ وہ کامنی کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن ساگر کے نام اس کا خط پڑھ کر وہ سب کچھ جان گئی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے دھوبن کو میلے کپڑے دیتے وقت ساگر کی ایک قمیص کی جیب سے وہ خطوط اچانک اس کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اور انہیں پڑھنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکے ذہن میں

انگارے بھر دیے ہوں ۔ اس نے جلدی سے دھوبن کو رخصت کیا اور پلنگ پر گر کر سسکیاں لینے لگی ۔

ادھر پرنسپل نے گھبراہٹ میں ایک پرچہ لکھ کر چپراسی کے ذریعہ پروفیسر ساگر کو بھجوا دیا ۔

ساگر سکنڈ ایر انگریزی کی کلاس لے رہا تھا ۔ اس نے پرچہ پڑھا اور مسکرا کر جیب میں ڈال لیا ۔

ادھر رما نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور پھر میز سے کامنی کا خط اٹھا کر پڑھنے لگی ۔

" ڈیر ساگر !

تم اتنی جلدی اپنا وعدہ بھول گئے ؟ میں آج بھی اپنے دل کے مندر میں براجتی ہوئی تمہاری خیالی مورتی کی پوجا کرتی ہوں ۔ میں آج بھی تمہیں اپنی سونی مانگ کا سیندور سمجھتی ہوں ۔ مجھے اپنی محبت نہ دے سکو تو نفرت تو نہ دو ۔ میں آج شام کے چھ بجے ساحل پر تمہارا انتظار کروں گی

تمہاری

کامنی "

رما کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کامنی کا خط چھوٹ کر نیچے گر گیا ۔ اس نے اپنے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو پونچھے اور ساگر کا خط اٹھا کر پڑھنے لگی ۔

" پیاری کامنی !

کاش ! تم میری مجبوریوں کا اندازہ لگا سکتیں ۔ تم نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں نے تمہیں بھلا دیا ۔ میرے دل میں اب بھی تمہاری یادوں کے دیپ جلتے ہیں ۔ اب بھی میرا دل تمہیں پوجتا ہے ۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑ گئی ہیں ۔ لیکن میں ان بیڑیوں کو توڑ کر آج ضرور تم سے ملوں گا ۔ میرا انتظار کرنا ۔

تمہارا اپنا

ساگر "

" تمہارا اپنا ساگر ! "

رما نے زیرِ لب دہرایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اُس کی نظروں کے سامنے ایک ہفتہ پہلے کا منظر گھوم گیا۔
جب ساگر اسے بیاہ کر لایا تھا۔ اُس نے کتنے ڈراماتی انداز میں کہا تھا ـــــ

" رما! آج سے ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ لیکن اس نئی زندگی کے آغاز سے پہلے ہمیں پچھلی تمام باتیں بھول جانی چاہئیں۔ انسان سے کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی موڑ پر کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے امید ہے تم میرے لئے ایک آئیڈیل بیوی ثابت ہوگی۔"

ساگر کی آواز کانپ کر رہ گئی۔ اور اس نے جھک کر رما کی پیشانی چوم لی۔ رما شرم سے اور سمٹ گئی۔ اور ساگر نے بے حد جذباتی لہجے میں کہنا شروع کیا ـــــ

" رما! تمہیں پاکر مجھے اور کسی چیز کی چاہ نہیں رہی۔ اس دل میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں بس سکتا۔ تم ہمیشہ مجھے اپنا پرستار پاؤ گی۔ اور مجھے امید ہے تم بھی ...."

اور ـــــ

اور رما کے ہاتھ کو ساگر نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لے کر فرطِ محبت سے چوم لیا۔
شرم سے رما کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے بے خود ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رما نے محسوس کیا جیسے یہ آج ہی کی بات ہو۔ جیسے ابھی ابھی ساگر نے فرطِ محبت سے اس کا ہاتھ چوم لیا ہو۔ اچانک اس نے اپنے ہاتھ پر سرسراہٹ سی محسوس کی اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ساڑی کے آنچل سے رگڑ ڈالا جیسے اس پر سے ساگر کے ہونٹوں کی گندگی پونچھ ڈالنا چاہتی ہو۔ ساگر اسے اتنا بھیانک فریب دے گا۔ وہ پہلے کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ اور سوچتی بھی کیسے۔ بی۔ اے میں اس کے ساتھ کتنی ہی خوبصورت لڑکیاں ایسی تھیں جن کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ پروفیسر ساگر کو پا سکیں۔ لیکن وہ نظریں نیچے کئے ہوئے کلاس میں داخل ہوتا۔ اس کے لکچر کے درمیان لڑکیاں حسرت سے اس کی طرف دیکھتی رہتیں۔ لیکن وہ ایک بار بھی نظریں اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھتا۔ اور اس کی اس سرد مہری پر

اس کی غیر حاضری میں لڑکیاں اسے "پتھر" کہا کرتی تھیں۔

لیکن رما کے لئے شروع ہی سے ساگر کے دل میں نرم گوشے موجود تھے۔ وہ خود بھی ساگر کو پسند کرتی تھی۔ اور ساگر نے ایک دن اچانک اس کی نظروں میں اس کی پسند پڑھ لی تھی۔ اس لئے جب رما نے بی۔ اے کر لیا تو اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ایک دن رما کے والد شرما جی کے پاس اپنا پیغام بھیج دیا۔ شرما جی نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اور ایک ہفتہ بعد نہایت سادہ طریقے سے ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد ساگر نے رما کی جھولی خوشیوں سے بھر دی۔ رما کو اپنی قسمت پر ناز تھا۔ لیکن یہ خط ——— !؟

اس کے دماغ میں پھر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور اس کے دل پر نشتر سا چلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی نظروں کے سامنے دھندلی چھائی جا رہی تھی اور اس کا دل غم کی بے پناہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

وہ غم سے نڈھال ہو کر لکھنے کی میز پر بیٹھ گئی۔ ساگر کے نام خط لکھ لینے کے بعد اس نے اسے میز پر رکھ کر پیپر ویٹ سے داب دیا۔ اور ایک سوٹ کیس میں کچھ روپے اور کپڑے رکھ کر اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔ گھر کی نوکرانی اسے روکتی ہی رہ گئی۔ جب ساگر کالج سے واپس آنے کے بعد اپنے دوست موہن اور اس کی خوبصورت نوجوان بیوی لتا کے ساتھ ٹیکسی سے نیچے اترا تو اسے ایک عجیب پُر اسرار سناٹے کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے موہن اور لتا کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ایک انجانے جذبے کے تحت دوڑتا ہوا رما کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن رما وہاں نہیں تھی۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے پلٹنے ہی والا تھا کہ یکایک اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے خط پر پڑ گئی۔ اس نے اسے جلدی سے اٹھا لیا اور پڑھنے لگا ———

"ساگر! آج میں تم سے بہت دور جا رہی ہوں۔ میں نے تمہیں دیوتا سمجھ کر پوجا۔ لیکن تم وہ نہیں نکلے جو میں نے تمہیں سمجھا تھا۔ ساحل پر کامنی تمہارا انتظار کرتی ہوگی۔ مجھے ڈھونڈنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا۔

رما"

رما کا خط پڑھنے کے بعد ساگر کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی اور فضا میں خنکی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ وہ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور رما کا خط لتا اور موہن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی خط پڑھ کر پریشان ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اچانک ساگر کی نظر گھڑی پر پڑی اور وہ چونک اٹھا۔

"موہن! میرا خیال ہے کہ رما ہمیں اسٹیشن پر ضرور مل جائے گی۔ ابھی بمبئی میل کا وقت ہے۔"

ساگر نے موہن کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"لتا! ہمارے واپس آنے تک تم یہیں ہمارا انتظار کرنا۔"

موہن نے پلٹ کر لتا سے کہا اور ساگر کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

بمبئی میل چھوٹنے ہی والی تھی۔ سگنل گر چکا تھا اور گارڈ ہری جھنڈی دکھا رہا تھا۔ ساگر دیوانوں کی طرح ایک ایک ڈبے میں جھانکتا پھر رہا تھا۔ یکایک اس کی بے چین نظریں رما پر پڑیں جو اگلے ڈبے کا ہینڈل پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"رما ـــــ!"

ساگر نے پیچھے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی آواز کانپ کر رہ گئی اور اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رما تڑپ اٹھی۔

"بھابی! گھر چلئے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ چھوٹے سے مذاق کا اتنا اثر لیں گی!"

موہن نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اور ساگر اور موہن رما کو لئے ہوئے اسٹیشن سے نکل کر اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اور ٹیکسی گھر کی طرف چل پڑی۔

لتا اپنی بے چین نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہارن کی آواز سن کر وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور رما کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

ڈرائنگ روم میں رما خاموش، اداس، نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ ساگر، موہن اور لتا تینوں اسکی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

یکایک ساگر نے لتا سے اشارے میں کچھ کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

لتا نے اپنی کرسی رما کے قریب کھینچ لی اور اپنے منی بیگ سے ایک سادہ کاغذ نکال کر لکھنے لگی ——

ڈیر ساگر!

تم اتنی جلدی اپنا وعدہ ....

تمہاری

کامنی "

رما نے حیرت سے اس خط کو دیکھا اور اپنے منی بیگ سے کامنی کا وہ خط نکال کر دیکھنے لگی جسے کچھ دیر پہلے پڑھ کر وہ دیوانی سی ہو گئی تھی۔

" دونوں خط سامنے رکھ کر لتا کی تحریر ملا لو بھابی! لتا اور ساگر نے یہ خط میرے سامنے ہی لکھے تھے" موہن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" رما! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری معمولی سی پرکھ اتنا بھیانک موڑ لے لے گی!"

ساگر نے رما کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اور یکایک ساری باتیں سمجھ کر رما کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اسکے ہونٹ کانپنے لگے۔

لتا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ رما تیزی سے اس کی طرف جھپٹی۔ لیکن لتا پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ رما اسے پکڑ سکتی وہ مسکراتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

اور ڈرائنگ روم میں ساگر اور موہن کے قہقہے گونج اٹھے۔

بیسویں صدی، دہلی۔ مئی ۱۹۶۰ء

جون کا سورج آگ برسا رہا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور نظر تک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

ایم۔ ایل روڈ کے آخری موڑ پر میونسپل ٹب کے کنارے ایک بدخوم گندے چاولوں کے ڈھیر پر تیزی سے منہ مارے جا رہا تھا۔ اُس کے نزدیک ہی ایک نوجوان بھکارن حسرت و یاس کی تصویر بنی ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے اُس کا جوان جسم جھانک رہا تھا اور اس کے مُرجھائے ہوئے چہرے کے ہلکے ہلکے دلکش خطوط سے صاف ظاہر تھا کہ کبھی بے حد حسین رہی ہوگی۔

اس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں سے بے پناہ درد جھلک رہا تھا اور اُس کے گندے لیکن حسین چہرے پر محرومیوں اور مایوسیوں کی گہری لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ اپنی ویران نظروں سے گندے چاولوں کے اُس ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو دیکھتے دیکھتے ختم ہوا جا رہا تھا۔

لیکن اس کی آنکھوں میں ایک جھجک تھی، ایک گریز تھا۔

اسی وقت نہ جانے کدھر سے آوارہ سے دو نوجوان آ گئے۔ ان کی نگاہیں جب اس نوجوان بھکارن پر پڑیں تو وہ اچانک ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"کیا خیال ہے استاد! بھوک لگ رہی ہے!؟"

پستہ قد والے نوجوان نے اپنے ساتھی کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھی نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اپنے گندے ہونٹوں پر ایک گندی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

" چلے گی !! "

اور دونوں آہستہ آہستہ نوجوان بھکارن کی طرف بڑھنے لگے۔ پورا راستہ سنسان پڑا تھا۔ اور وہ آوارہ نوجوان اپنے شکار پر جھپٹنے کے لئے آہستہ آہستہ اس کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔

لیکن بھکارن ان کے وجود اور ان کے ناپاک ارادے سے بے خبر حسرت بھری نظروں سے چاول کے اس ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو دیکھتے دیکھتے ختم ہوا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ایک جھجک سی تھی اور اس کی روح ایک اذیت ناک احساس میں مبتلا تھی۔

اچانک دو خوفناک ہاتھ اس کی طرف بڑھے اور وہ چونک اٹھی سہم کر رہ گئی۔ یکایک اس کی آنکھوں کی ساری جھجک ختم ہو گئی اور وہ بجلی کی طرح گندے چاولوں کے ڈھیر پر گر پڑی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ کا لقمہ اس کے منہ تک جاتا وہ درندے اسے اٹھا کر ایک ویران گلی میں گم ہو گئے!

اور دور ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے دروازے سے لگی اس کی بوڑھی اور اپاہج ماں بھوک سے بلکتی اس کا انتظار کرتی رہی!

بعنوان " درندے "

پرستان، دہلی اگست ۱۹۶۰ء

پیازی رنگ کا ایک خط میز پر پڑا تھا۔

سلام کئی بار اس خط کو بے تابی سے پڑھ چکا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی تشنگی نہیں بجھی تھی۔ وہ اس طرح خط کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے خط نہ ہو کوئی حسین و جمیل دلہن ہو جو اپنی سج دھج سے آنکھوں میں سمائی جا رہی ہو۔ خط کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا پھر بھی اس کے دل کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ اس نے اپنی کانپتی انگلیوں سے ایک بار پھر خط اٹھا لیا اور دل کی دھڑکنوں کو سمیٹ کر پڑھنے لگا ——

لاہور

محترمی سلام صاحب! ہدیہ خلوص

ماہنامہ "طلوع" آج ہی ملا ہے۔ آپ کا افسانہ "چاند کا داغ" پڑھا یقین جانیے رسمی کے الفاظ میں افسانہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض پاگل لڑکیاں کہانی کاروں کی خوبصورت، نفیس کہانیاں پڑھ کر عجیب عجیب خواب دیکھنے لگ جاتی ہیں اور حسین خوابوں میں کھو کر یہ بھول جاتی ہیں کہ کہانی کار بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ اس کی عمر بھی بڑھاپے کی منزلوں کو چھو سکتی ہے۔ اس کے بھی دوسرے لوگوں

کی طرح بیوی بچے ہو سکتے ہیں۔ اوہ! معاف کیجئے! میں بھی کیا واہی تباہی لکھنے لگی۔ میں ایک جذباتی لڑکی ہوں۔ مجھے بڑی سے بڑی بات بھی متاثر نہیں کر سکتی۔ اور کبھی ذرا سی بات پر گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں۔ ہر طرح کی فکر سے آزاد ہوں۔ زمانے نے کوئی دکھ، کوئی زخم نہیں دیا۔ اسلئے آپ کی دکھ بھری کہانی پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ گھنٹوں سوچتی رہی۔ چاند کے داغ کو آپ سے کیا نسبت؟ کہیں "چاند کا داغ" آپکے اپنے زخم کا داغ تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ واقعی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ میری پوری ہمدردی آپکے ساتھ ہے۔ کاش میں آپکا درد بٹا سکتی! خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

مخلص

منور ناہید

خط سلام کی انگلیوں میں لرز رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کے خزاں زدہ چمن میں اچانک بہار آگئی ہو اور ہر طرف ننھے ننھے شگوفے چٹک اٹھے ہوں۔ مایوسیوں کی تاریکی میں اسے امید کی ہلکی سی کرن دکھائی دی اور اس نے ناہید کا خط اٹھا کر بے اختیار آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسی وقت اس کی بہن سلمیٰ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"بھائی جان! آپنے بھی کمال کر دیا، یہ خط تو کاغذ کا معمولی سا ایک ٹکڑا ہے۔ کسی پیر فقیر کا دامن نہیں جو آپ اتنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں!"

سلمیٰ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر بدبخت! ابھی تجھے بتاتا ہوں۔"

سلمیٰ کو پکڑنے کیلئے وہ دروازے کی طرف لپکا۔

"بھائی جان! میں نے آج جاگتے ہی میں خواب دیکھا ہے کہ میرے آنگن میں بھابی کی مسکراہٹوں سے پھول کھل رہے ہیں!"

سلمیٰ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا اور ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

وہ مسکراتا ہوا میز کے سامنے آ بیٹھا۔ سلمیٰ کی بات نے اسے ناہید کے بارے میں ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس بار وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ مسلسل ٹھوکروں اور ناکامیوں نے اسے کافی تجربہ کار بنا دیا تھا اور اس بار وہ زندگی کا کھیل کسی اناڑی کی طرح نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ جس طرح دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اسی طرح وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں بند کئے خیالات کی دنیا میں کھویا رہا۔ اور جب آنکھیں کھلیں تو لکھنے لگا ــــ

اُستول

ناہید صاحبہ! تسلیمات

نوازش نامہ مل کر موجب مسرت ہوا۔ آپ کو میرا افسانہ "چاند کا داغ" پسند آیا۔ قدر افزائی کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔

چاند کے داغ کو میرے دل کے داغ سے نسبت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ چاند کے داغ کو ہر کوئی دیکھ لیتا ہے۔ لیکن میرے دل کے داغ پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ مجھے زمانے نے بہت ستایا ہے۔ میرے دل میں زخم ہی زخم ہیں۔ میں نے بہت حساس دل پایا ہے۔ دوسروں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ لیکن میرے آنسوؤں کی کسی نے پروا نہیں کی۔ جب میرا کوئی افسانہ کسی پرچے میں شائع ہوتا ہے تو لڑکیوں کے کتنے ہی خطوط ملتے ہیں۔ اکثر خطوں میں تصویر بھیجنے کے لئے اشتیاق و اصرار ہوتا ہے۔ اور جب تصویر بھیج دیتا ہوں تو اس کی رسید تک نہیں آتی۔ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ کسے اپنا دکھڑا سناؤں؟ کسے اپنے دل کے داغ دکھاؤں؟ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ کاش

کوئی اپنا ہوتا جو زندگی کی سُونی راہ پر میرا ساتھ دیتا! میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ کاش ......

اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

خلوص کار

سلام ظفر

خط جواب طلب نہیں تھا پھر بھی سلام سراپا اشتیاق و اضطراب بن کر ناہید کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن جب وہ دفتر جا چکا تھا پوسٹ مین ناہید کا خط دے گیا۔ سلمٰی نے خط پڑھ کر ٹیبل کلاتھ کے نیچے چھپا دیا اور جب چار بجنے لگے تو سلام کے کمرے میں آکر اس کا انتظار کرنے لگی۔ ساڑھے چار بجتے ہی سلام کمرے میں داخل ہوا اور سلمٰی اسے دیکھتے ہی بول اٹھی ــــ

"بھائی جان! ایک خوشخبری ہے۔ لیکن پہلے مٹھائی کھانے کا وعدہ کیجئے۔"

"مٹھائی کھائے گی! صورت دیکھی ہے آئینے میں؟

سلام نے منھ بنا کر کہا۔

"جی پرسوں دیکھی تھی!"

سلمٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج پھر دیکھو۔ یہ منھ اور مسور کی دال!"

سلام نے سلمٰی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ سلمٰی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ رالعبہ بیگم سلام کے لئے چائے اور پلیٹ میں سموسے لے کر آ گئیں۔

"بھئی کتنی بار کہا کہ آپس میں مت لڑا کرو۔"

رالعبہ بیگم نے میز پر ناشتے کا سامان رکھتے ہوئے کہا۔ پھر سلمٰی سے مخاطب ہو کر بولیں ــــ

"جاؤ پیچھے جا کر دیکھو ورنہ بچے آپس میں لڑیں گے۔"

"جاتی ہوں ابھی دوسری میز سے ایک چیز لے لوں۔"

سلمٰی نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ کے نیچے سے خط نکال لیا۔ لیکن اس کے قدم اٹھانے سے پہلے سلام نے اس کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ اور سلمٰی ہنستی ہوئی نیچے باورچی خانے میں چلی گئی۔

"ابھی اس کا بچپنا نہیں گیا"۔ رابعہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں امّی! دیکھئے نا، مجھے ہر وقت پریشان کرتی رہتی ہے۔"

"تم نے خود ہی بے جا لاڈ پیار سے اسے شوخ کر دیا ہے۔"

"امّی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"نہیں بیٹے! اللہ رکھے اب سترہ سال کی ہو رہی ہے۔ کہیں تمہاری نسبت طے ہو جائے تو ساتھ ہی اسکے ہاتھ بھی پیلے کر دوں۔ دیکھو خدا یہ خوشی کب دکھاتا ہے۔"

رابعہ بیگم نے یاس آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے سلام کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"یہ خط کہاں سے آیا ہے؟"

"میرے ایک دوست کا خط ہے!"

سلام نے گھبرا کر خط چھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا! پہلے ناشتہ کر لو پھر خط پڑھ لینا۔"

رابعہ بیگم نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اور سلام ہاتھ دھو کر کھانے لگا۔ لیکن رابعہ بیگم کے جاتے ہی اس نے جیب سے خط نکالا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پڑھنے لگا ——

لاہور

سلام صاحب! اسلام و احترام

آپ کا خط مل کر باعثِ مسرت ہوا۔ ساتھ ہی باعثِ حیرت بھی۔ میں آپ کی کئی کہانیاں پڑھ چکی ہوں۔ آپ کی کہانیوں میں احساس و جذبات کی شدت ہوتی ہے۔ ان میں محرومیوں اور ناکامیوں کی دلگداز داستان ہوتی ہے۔ آپکی کہانیوں میں زندگی کراہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور زندگی کی اسی کراہ نے میرے خیالات کو آپ کی طرف مائل کر دیا۔

آپ کو ساتھی اور سہارے کی ضرورت ہے!

آپ تو خود دوسروں کا سہارا بن سکتے ہیں۔ کون ایسا ہوگا جو آپ جیسے عظیم فنکار کا ساتھی بن کر فخر و مسرت محسوس نہ کرے گا۔

تصویر والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تصویر پا کر لڑکیاں تصویر کی رسید تک نہیں بھیجتیں، پھر خط نہیں لکھتیں۔ میں یہ راز نہ سمجھ سکی۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو وضاحت فرمائیں۔ عجیب بات ہے!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز آگیں

ناہید

"کاش! میں اتنا بدصورت نہ ہوتا!"

سلام نے نہایت کرب کے ساتھ اپنے آپ سے کہا اور اٹھ کر آئینے کے سامنے آگیا۔ آئینے میں اپنے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا دل چاہا کہ گلدان مار کر آئینہ توڑ دے اور سارا چہرہ لہولہان کر لے تاکہ چہرے کا سفید اور بدنما داغ خون کی سرخی میں چھپ جائے۔

"کاش! میں ایک فنکار نہ ہوتا۔ ایک معمولی انسان ہوتا۔ لیکن چہرے پر یہ سفید داغ نہ ہوتا۔"

اُس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا اور پیڈ اٹھا کر ناہید کو خط لکھنے لگا ـــ

آسنول

ناہید صاحبہ! خلوص بیکراں

آپکا خط ملا۔ شکریہ!

آپنے بجا فرمایا کہ میری کہانیوں میں محرومیوں اور ناکامیوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ایک کہانی کار جو کچھ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے وہی اپنی کہانیوں میں پیش کرتا ہے۔ وہ جن حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اسکی بیشتر کہانیوں میں اُس کی جھلک ہوتی ہے۔

میں حالات کا ستایا ہوا ایک ایسا بدنصیب ہوں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل کو سکون نہیں۔ اندوہ و آلام کے اس صحرا میں کوئی اپنا نظر نہیں آتا جس کی زلفوں کے سائے میں سکون پا سکوں۔

لڑکیاں مجھ سے دور بھاگتی ہیں اور میرا بدنما چہرہ دیکھ کر منھ پھیر لیتی ہیں اور میں شدتِ غم سے اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ جاتا ہوں۔

ایک معمولی سا حادثہ اتنا اندوہناک المیہ بن گیا۔

بچپن میں کھیلتے کھیلتے اچانک منھ کے بل چولہے پر گر پڑا تھا۔ چولہے میں کوئلے جل رہے تھے۔ گرتے ہی سارا چہرہ جھُلس گیا اور پلکیں تک جل گئیں۔ پاس ہی والدہ بیٹھی ہوئی کوئی کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک چیخ مار کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ آنکھوں کی بدنمائی تو سیاہ عینک سے چھُپ گئی۔ لیکن چہرے کا سفید داغ نہ مٹ سکا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اب میں ہوں اور میری سنسان تنہائیاں ہیں۔

دفتر سے آ کر اپنے کمرے میں خود ہی نظر بند ہو جاتا ہوں۔ ماں کی شفقتیں اور
بہن کا پیار ملتا ہے۔ لیکن زندگی کے کچھ اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ میری زندگی
ایک ایسی بے آب و گیاہ وادی ہے جس میں کبھی کسی کے پیار کے پھول نہیں کھلے۔
ڈرتا ہوں حسرت و آلام کی کڑی دھوپ سے کسی دن زندگی کی بے آب و گیاہ
وادی تپتا ہوا صحرا نہ بن جائے۔

بدنصیب

سلام ظفر

سلام تین دن سے شدید بخار میں مبتلا تھا مسلسل بخار نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ وہ اپنے اوپر شال
ڈالے پلنگ پر پڑا تھا اور چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ اسوقت وہ ساری دنیا سے بے خبر ناہید کے حسین
تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اسی وقت سلمیٰ دبے قدموں سے اندر داخل ہوئی اور سلام کو ناہید کا خط دکھلاتے
ہوئے بولی ــــــ

"بھائی جان! یہ لیجیے آپ کو جس کا انتظار تھا وہ اڑتا ہوا آپ تک آپہنچا ہے!"
لفافے پر پتہ دیکھتے ہی سلام کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جلدی سے سلمیٰ سے لفافہ لے لیا اور چاک ــــــ
کر کے پڑھنے لگا ــــــ

میٹروپول ہوٹل۔ مری

سلام صاحب باتسلیم

آپ کا مکتوب لاہور ہی میں موصول ہو چکا تھا۔ لیکن اسی دن مجھے ایک دن
ایک ضروری کام کے سلسلے میں مری آنا پڑا ورنہ دسمبر کی سردی میں مری کا
نام کوئی دیوانہ ہی لے گا۔ یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں لاہور جا کر بھی آپکے

خط کا جواب لکھ سکتی تھی۔ لیکن پھر یہ سنسان تنہائیاں کس طرح ختم ہوں گی؟ ہوٹل کے اندر کا ماحول ویران اور بے رونق ہو چکا ہے اور باہر مری برف کی گود میں محوِ خواب ہے۔

آپ نے مجھے اپنا سمجھا اور مجھ پر اعتماد کر کے اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ اس کے لئے آپکی ممنون ہوں اور آپکے غم میں برابر کی شریک ہوں۔ کاش ہمارے درمیان یہ طوالت نہ ہوتی۔ یہ فاصلے نہ ہوتے۔ میں اُن لڑکیوں کی طرح نہیں جو ظاہری حُسن کی پرستار ہوتی ہیں۔ میں تو حسنِ باطن کی پرستار ہوں۔ میری نظر میں ظاہری حُسن کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ ظاہری حُسن سے محروم ہیں تو کیا ہوا؟ خدا نے آپکو حُسنِ باطن سے نوازا ہے۔ اور یہ بہت بڑی دولت ہے۔

لاہور سے میری ایک سہیلی ایک ادبی اور معیاری پرچہ نکالتی ہیں۔ اس کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا۔ براہ کرم میری خاطر اپنی پہلی فرصت میں سالنامہ کیلئے کوئی کہانی ارسال کیجئے۔ میں اپنی سہیلی سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اُمید ہے آپ مایوس نہ کرینگے۔ کہانی لاہور کے پتے پر ارسال کیجئے۔ میں کل ہی مری سے روانہ ہو رہی ہوں۔

خلوص کیش

ناہید

ناہید کا خط پڑھ کر سلام خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ شال ایک طرف پھینک کر وہ پلنگ سے نیچے اُتر آیا اور پیار سے سلمیٰ کی چوٹی کھینچتے ہوئے بولا ——

"سلمیٰ تم ہمیشہ مجھ سے مٹھائی کیلئے لڑا کرتی تھیں نا؟ لو آج جی بھر کے مٹھائی کھاؤ۔ آج مجھے زندگی میں پہلی بار اتنی خوشی نصیب ہوئی ہے۔"

سلام نے سلمیٰ کی طرف پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"واہ بھائی جان! صرف پانچ روپے؟ اور گیت گانے والی لڑکیاں جو آئیں گی وہ کیا منہ دیکھیں گی؟" سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سلمیٰ! میں اس بار تمہیں منع نہیں کروں گا۔ خوب دل کھول کر خوشیاں مناؤ۔"

سلام نے سلمیٰ کی طرف پانچ روپے کا ایک اور نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ نوٹ لے کر ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

ناہید کا خط پڑھ کر سلام کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ حُسنِ باطن کی پرستار ہے۔ ظاہری حُسن تو اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی پیاسی روح صدیوں سے ناہید کی متلاشی تھی۔ اور اب اگر اُسے ناہید نہ مل سکی تو اُسکے لئے جینا محال ہو جائے گا۔ اُس کا جی چاہا اُڑ کر ناہید کے پاس جا پہنچے اور اُس کی ریشمی زلفوں میں منہ چھپا کر کہے ——

"اب تاب ضبط نہیں۔ میری پیاسی اور سلگتی ہوئی زندگی پر اپنی زلفوں کا سایہ ڈال دو!"

دوسرے ہی دن سلام نے ڈیوٹی جوائن کر کے پاسپورٹ کے لئے درخواست دے دی۔ ایم۔ ایل۔ اے سے اُس کی شناسائی تھی۔ اُس نے ڈی۔ ایم۔ سے سفارش کر دی اور جلدی ہی اسے پاسپورٹ مل گیا۔ پاسپورٹ ملتے ہی اُس نے دفتر سے چھٹی لے لی اور لاہور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اور پھر ایک دن سلام اپنی امّی سے اجازت لے کر دل میں حسین خیالات کی محفل سجائے ہوئے لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر سلام کو ناہید کا پتہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ناہید کے والد منور احسن وہاں کے مشہور بیرسٹر تھے۔ اُن کی شاندار بلڈنگ کے سرسبز و شاداب لان میں سلام کو زندگی مسکراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہر طرف خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے جن کی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔

سلام نے بے خود ہو کر اپنی کانپتی ہوئی اُنگلی کال بیل پر رکھ دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک خوبصورت

لڑکی دروازہ کھول کر اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس کے پیچھے ایک اور لڑکی تھی جو خوبصورتی کے لحاظ سے اس سے کچھ کم تھی۔ سلام کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس کے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی یکایک چونک اٹھی۔

"آپ — آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

سلام نے لڑکی کی طرف دیکھا اور خوبصورت آنکھوں پر لرزتی ہوئی غلافی پلکیں دیکھ کر مسحور ہو گیا۔

"میں — میں آسنسول سے آیا ہوں۔ مجھے مس منوّر ناہید سے ملنا ہے۔"

"اوہ — کیا آپ سلام ظفر ہیں؟" لڑکی کی خوبصورت آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جی ہاں۔ میں سلام ظفر ہوں۔ کیا آپ ہی مس منوّر ناہید ہیں!؟"

سلام نے بے تاب و مضطرب لہجے میں کہا۔

"جی ہاں — جی نہیں، جی نہیں — میں اُن کی سہیلی ہوں۔ وہ تو باہر گئی ہوئی ہیں۔"

لڑکی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کچھ بتا کر تو گئی ہوں گی کہ کہاں گئی ہیں اور کب تک آئیں گی!؟"

سلام نے حیرت سے کہا۔

"جی نہیں، کچھ بتا کر نہیں گئیں۔"

لڑکی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے رخی سے کہا۔

"خیر، واپس آجائیں تو انہیں یہ کہانی دے دیجیے گا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اتنی دور سے آیا اور ملاقات نہ ہو سکی۔"

سلام ظفر لڑکی کے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لفافہ دے کر چلنے لگا۔

چند ہی قدم چلنے کے بعد یکایک اُسے دوسری لڑکی کی آواز سنائی دی —

"میں نے تم سے کئی بار کہا کہ مردوں کو اسقدر لفٹ دینے کا انجام بہت برا ہوتا ہے

لیکن تم مانتی ہی نہیں ہو۔"

"اوہ، میں کیا جانتی تھی کہ یہ احمق اس طرح یہاں تک پہنچ جائے گا!"

پہلی لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اور یکایک سلام ظفر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیل دیا ہو۔

اُس کے حسین خواب بکھر گئے۔

دل کا مندمل زخم پھر ہرا ہو گیا۔ پلکوں پر آنسوؤں کی دو بوندیں لرزنے لگیں اور وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیسویں صدی، دہلی

جون سنہ ۱۹۶۲ء

ڈوبتے سورج کا کرب

انسان جاگ اُٹھا

ناہید نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کراہ کر کٹی ہوئی شاخ کی طرح پھر چارپائی پر گر پڑی اور اس کی کربناک سسکیوں سے کمرے کی بوجھل فضا میں بے ہنگم سا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس کے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر چوٹوں کے نیلے نشان ابھر آئے تھے جن سے درد کی ٹیسیں اٹھ اٹھ کر اس کی روح کو زخمی کر رہی تھیں۔

اُس کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن پانچ سال کے اس طویل عرصے میں اسے کبھی اپنے شوہر سے کوئی سُکھ نہ ملا۔ شادی کی پہلی ہی رات کو شوہر کے خلاف اُس کے دل میں گہری نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک اُس واقعہ کو نہ بھول سکی تھی۔ جیسے کل ہی کی بات ہو.......

وہ حجلۂ عروسی میں سرخ بیر بہوٹی بنی کمسائی بیٹھی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر دل بے اختیار دھڑک اٹھتا تھا اور نظریں متوحش انداز میں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ شادی کے سارے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ ہر طرف رات کی پُراسرار خاموشی مسلط تھی۔ صرف اس کے دل کی دھڑکنیں اسے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں، اور وہ رہ رہ کر کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھتی تھی۔

اچانک دیوار پر آویزاں گھڑی نے ٹن..... ٹن..... کی آواز کے ساتھ رات کے دو بجائے۔ اسی وقت باہر کسی کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی۔ آنے والا دروازے تک پہنچ کر رک گیا اور چند لمحوں تک شاید حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر نہایت آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز ہوئی

اور ناہید نے سہم کر اپنا سر گھٹنوں کے درمیان چھپا لیا۔ حجلۂ عروسی میں ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ گونج اٹھی اور ناہید نے محسوس کیا جیسے کوئی بالکل اسکے قریب آکر اس پر جھک گیا ہو۔ اس کی گرم گرم سانسیں موسم گرما میں چلتی ہوئی لُو کے تیز و تند جھونکے کی طرح ناہید کی گردن کو جھلسانے لگیں۔ وہ اور بھی سمٹ گئی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں آنے والے کی آواز گونج اٹھی۔

"ناہید! اس چاند سے مکھڑے کو یوں گھونگھٹ میں نہ چھپاؤ۔ بازوؤں کا حلقہ توڑ ڈالو تاکہ میں بھی حسن کی ضیا پاشی سے سیراب ہو سکوں۔ دیکھو آؤ کہ ہم دونوں کے وجود ایک ہو جائیں۔"

اچانک دو اجنبی ہاتھوں نے اس کے شانوں کو تھام لیا۔ اس نے بازوؤں کا حلقہ اور تنگ کرنا چاہا۔ لیکن اچانک آنے والے نے اس کی بغلوں میں اپنی انگلیاں چبھو دیں اور وہ بے بس ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی آنے والے پر اس کی نظر پڑی وہ کسی زخمی چڑیا کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔ شوہر کے روپ میں ایک کالے کلوٹے بندر کو دیکھ کر اس کی ارمان بھری دنیا پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کی پلکیں خود بخود بند ہو گئیں اور حسین چہرہ تاریک ہو گیا جیسے یکایک چاند کو گہن لگ گیا ہو۔

"کیوں؟ ڈر گئیں!؟"

اُس نے طنزآمیز لہجے میں کہا۔ ناہید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔

"ہاں میں بدصورت ہوں۔ مجھ سے کوئی پیار نہیں کر سکتا۔ کوئی نہیں۔ لیکن تم تو میری شریک حیات ہو۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھی۔ کیا تم بھی غیروں کی طرح میری بدصورتی کا مذاق اڑاؤ گی؟"

"نہیں، میں آپ سے پیار کروں گی۔"

ناہید نے شرماتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اتنا بدصورت ہوں اور تم اتنی خوبصورت!"

"پیار کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ صورت سے کیا ہوتا ہے؟ دل خوبصورت ہونا چاہیے۔"

"پیار کسی سے بھی ہو سکتا ہے! ناہید! کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

"ہاں، میں نے اپنے والدین سے پیار کیا ہے۔ اپنے بھائی اور بہنوں سے پیار کیا ہے۔ اپنی سہیلیوں سے

پیار کیا ہے اور........"

"اور ان کے علاوہ ؟"
"یہ آپ کیا کہتے ہیں؟"
"ناہید! یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ بولو کیا تم نے اس سے پہلے کسی اور سے پیار کیا ہے؟ تمہیں میری قسم!"
اُس کے شوہر نے اپنی کم ظرفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور حالات کے اس رُخ نے اُسے کانٹوں کی راہ پر گھسیٹ لیا۔
انسان کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی ایک ایسا لمحہ آیا تھا جب وہ انجانے میں نسیم کو دل دے بیٹھی تھی۔ لیکن نسیم ایک دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ وہ بہار کے جھونکے کی طرح اس کی زندگی کے چمن سے نکل گیا اور وہ ایک خزاں زدہ پتے کی طرح عرفان کی گود میں گر پڑی۔

گزرتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے اسکے دل کا زخم ہرا ہو گیا اور اس کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے۔

"ناہید! تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟ کیا تم نے........؟"
اسکے شوہر نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن وہ خاموش رہی اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر گر کر فرش میں جاذب ہوتے رہے۔ بھلا وہ کس طرح اپنی محبت کا اقرار کر سکتی تھی؟

"ناہید ــــ!"

اس کا شوہر غصہ سے کانپنے لگا۔ اس نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور گلے میں پڑے ہوئے ہاروں کو نوچ کر پھینک دیا۔

"خوبصورت ناگن! تمہیں ڈسنے کے لئے صرف میں ہی ملا تھا!"
اس نے اس کی گردن میں اپنی سوکھی ہوئی انگلیاں پیوست کرتے ہوئے کہا اور اس کی پاکیزہ روح کو اپنی کم ظرفی اور نفرت کے تیروں سے چھلنی کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور بہار کی رنگینیاں بکھرنے سے پہلے اس کی زندگی خزاں آلود ہو گئی۔ خوشیوں کے پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گئے۔ اس کی زندگی تپتے ہوئے صحرا کی مانند ہو گئی جس میں کوئی کلی نہ کھل سکی۔ نسیم کے ساتھ محبت کا حادثہ اس کی زندگی کا اندوہناک

المیہ بن گیا۔ اس کی زندگی میں زہر گھل گیا۔ وہ پیار کے دو بول کے لئے ترس گئی۔ شوہر کی جھڑکیاں اور گالیاں اس کی قسمت ہو گئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کا شوہر اس ناخوشگوار حادثہ کو بھول جائے۔ لیکن اس کی نفرت روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ کافی رات تک گھر سے باہر رہنے لگا۔ کچھ دنوں سے وہ پینے بھی لگا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگ کر اس کا انتظار کرتی اور جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوتا تو جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دیتی۔ لیکن وہ اسے جھڑک دیتا اور دوسرے کمرے میں جا کر جوتے سمیت بستر پر گر پڑتا۔ وہ جلدی سے اس کے لئے چولہے پر سے گرم گرم کھانا لے آتی اور میز پر رکھ کر اس کے جوتوں کے تسمے کھولنے لگتی۔ لیکن وہ نفرت سے پیر سمیٹ لیتا اور اسے کمرے سے باہر دھکیل کر اندر سے دروازہ بند کر لیتا۔ ناہید بستر پر گر کر کسی زخمی چڑیا کی طرح تڑپتی رہتی۔

آج کی رات ایسی ہی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا شوہر حسب معمول شراب کے نشے میں جھومتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دینا چاہا لیکن رخسار پر شوہر کا بھرپور طمانچہ پڑتے ہی وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اس کے شوہر نے اس کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور اس کے رخسار پر دوسرا طمانچہ لگاتے ہوئے کہا ــــــ

"تیری اتنی ہمت کہ تو اب اسے رات کی تاریکی میں یہاں بلانے لگی!؟"

"یہ آپ کیا کہتے ہیں!"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت آمیز لہجے میں بولی۔

"حرامزادی! اب معصوم بنتی ہے۔ کیا لوگ غلط کہتے ہیں کہ آج تیرا یار تجھ سے ملنے آیا تھا!؟"

اس نے اچانک اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا بھائی تھا اور مجھے یہ خبر دینے آیا تھا کہ امی سخت بیمار ہیں۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔"

ناہید نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چکرا کر گر پڑی اور اس کا شوہر طنز اور

نفرت کے تیروں سے اسکے سینے کو چھلنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سوچوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ناہید کو اپنے درد کا احساس ہوا۔ اس نے دیکھا جسم پر چوٹوں کے نشان ابھر آئے تھے جن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے دل میں شوہر کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس نفرت کو اپنے دل سے نکال دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر بھوکا ہوگا اور بغیر منھ ہاتھ دھوئے بستر میں گھس گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں شوہر کے لئے ہمدردی کا جذبہ ابھر آیا۔ اپنے درد کو بھول کر اس نے چاہا کہ اٹھ کر شوہر کو کھانا دے دے۔ لیکن وہ جیسے ہی ذرا سا اٹھی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سارا جسم اکڑ گیا ہو اور سینے میں دل کی جگہ ایک آہنی گولہ آکر پھنس گیا ہو۔ یکایک اسکے دل میں شدید درد اٹھا اور وہ تکلیف سے بے چین ہو کر کراہنے لگی۔

چھوٹے کمرے کے شکستہ در و دیوار پر زرد اور مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی پر اسرار خاموشی میں ناہید نے دیکھا کہ ایک لاش سفید کفن میں لپٹی ہوئی اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی آرہی ہے۔ وہ یکایک خوف سے سہم گئی۔ لیکن لاش کے چہرے پر روشنی پڑتے ہی اس نے پہچان لیا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

" ماں — !"

" بیٹی! تو مجھ سے ملنے نہ آسکی۔ اس لئے مجھے ہی کفن اوڑھ کر تیرے پاس آنا پڑا۔"

اس کی ماں نے اسے اس حالت میں دیکھ کر غمزدہ لہجے میں کہا۔

" ماں! تو کیا تم — ؟ ہائے میں آخری بار تمہیں دیکھ بھی نہ سکی۔"

ناہید نے فرط غم سے چیختے ہوئے کہا اور اس کی سسکیاں گونج اٹھیں۔ اچانک اس کا شوہر دروازہ کھول کر تیزی سے اس کی طرف آیا اور اس کے متورم سینے پر کئی گھونسے جماتے ہوئے کہا ——

" حرام زادی نخرے دکھاتی ہے!"

ناہید کا سینہ پہلے ہی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ پھر کئی گھونسے کھانے کے بعد اس کی حالت غیر ہو گئی اور اسے غش آگیا

"سالی نقل کرتی ہے!"

اس کے شوہر نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح دودھ والے کے بار بار زنجیر کھٹکھٹانے پر خلاف معمول بہت جلد اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

ناہید ابھی تک نہیں اٹھی، اسے یہ سوچ کر تعجب ہوا۔ اس نے دروازہ کھول کر دودھ لیا اور آہستہ سے ناہید کو آواز دی۔ لیکن ناہید نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے حیرت ہوئی۔ اس نے جلدی سے ناہید کے شانوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ لیکن وہاں زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ناہید کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کے دونوں بازو چارپائی کے نیچے جھول رہے تھے۔

"ناہید ــــ!" وہ چیخ اٹھا ــــ

"تم نہیں مر سکتیں ناہید! تم مجھے تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

اس کی چیخ سن کر آس پاس کے لوگ اندر چلے آئے۔ ایک بوڑھی عورت نے ناہید کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہوئے کہا ــــ

"ابھی نبض چل رہی ہے۔ جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔"

ایک آدمی دوڑ کر پڑوس کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔

"حالت بہت سیریس ہے۔"

ڈاکٹر نے ناہید کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! کچھ بھی کیجئے لیکن اسے بچا لیجئے۔ پلیز!"

عرفان نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر ایک انجکشن نکالا اور ناہید کے بازو میں لگانے کے بعد کہا ــــ

"اب یہ خطرے کی حد سے باہر ہیں۔ چند منٹوں میں ہوش آجائے گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب!"

عرفان نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے احسانمند لہجے میں کہا۔

"آپ نے انسان ہو کر اتنی درندگی کا ثبوت دیا!"

ڈاکٹر نے اس کی طرف گھورتے ہوئے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں بیحد شرمندہ ہوں ڈاکٹر صاحب!"

یہ کہتے ہوئے عرفان نے شرم سے گردن جھکالی۔ اسی وقت ناہید نے آہستہ سے کراہ کر آنکھیں کھول دیں اور سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ناہید نے اٹھنا چاہا لیکن ڈاکٹر نے سختی سے اُسے لیٹے رہنے کی تاکید کی اور بیٹھ کر نسخہ لکھنے لگا۔

ناہید کو ہوش میں آتے دیکھ کر عرفان کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اس کے چہرے سے غم کی گھٹائیں دور ہو گئیں۔ اس نے لوگوں کی موجودگی کو نظرانداز کر کے پیار سے ناہید کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ندامت آمیز لہجے میں بولا ـــــ

"ناہید! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا مجرم ہوں!"

ناہید نے حیرت سے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا جس سے پیار کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

"ناہید! میں پاگل تھا کہ تم جیسے ہیرے کو نہ پہچان سکا۔ تم میرے تاریک غم کدے میں پیار کی روشنی لے کر آئیں۔ لیکن میں نے آنکھیں موند لیں۔ تم نے پیار سے ہاتھ بڑھایا اور میں نے تمہیں نفرت سے ٹھکرا دیا۔ لیکن تمہارا سچا پیار آج میری جھوٹی نفرت پر غالب آگیا ہے۔ تمہاری خاموش خدمتوں اور قربانیوں نے میرے اندر ایک نئے انسان کو جنم دیا ہے!"

●●●

(ماہنامہ نقاش بھیمڑی۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

ڈوبتے
سورج کا کرب

تِلک کا بوجھ

کریم میاں نے وسیم صاحب کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

" وسیم صاحب! خدا کے لئے بارات واپس نہ لے جائیے۔ میں آپ سے اپنی عزت کی بھیگ مانگتا ہوں۔
مجھے اسطرح ذلیل نہ کیجئے۔ اگر آپ اس طرح بارات واپس لے گئے تو میری پاک اور معصوم بیٹی بدنام ہو جائے گی اور پھر
کوئی اس سے شادی کے لئے تیار نہ ہوگا۔"

بوڑھے کریم میاں کی کمر کچھ اور جھک گئی۔ اُن کا جھرّیوں بھرا چہرہ غم واندوہ میں ڈوب گیا اور اُن
کی سفید پلکوں پر دو آبدار موتی لرز اٹھے۔

شامیانے کے اندر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیرت زدہ سا بیٹھا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر
خاموش ہو چکا تھا اور ہر طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

" بیٹی کی شادی کا اتنا ارمان ہے تو پوری رقم کیوں نہیں نکالتے —!؟"

شہر کے مالدار تاجر وسیم صاحب نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

" وسیم صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے گھر میں صرف میرا لڑکا ہی کمانے والا ہے۔ اس بیچارے
نے ہر آسائش سے منھ موڑ کر اپنی قلیل تنخواہوں میں سے روپے بچا کر اور کئی برسوں تک دن رات محنت
کر کے کچھ روپے بچائے ہیں۔ آپ دو ہزار روپے قبول کیجئے اور قاضی صاحب کو نکاح پڑھانے کی اجازت دیجئے۔"

کریم میاں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دو ہزار روپیوں کی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کریم میاں! میں تمہارے دروازے پر بھیک لینے نہیں آیا۔ تم نے شادی کے موقع پر پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اس سے ایک پیسہ بھی کم نہیں لوں گا!"

وسیم صاحب کے اندر کا لالچی انسان شرافت کا لبادہ اتار کر سامنے آگیا۔ کریم میاں کو اپنے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں اور ان کے سینے میں غم واندوہ کا طوفان اُمنڈ پڑا۔

"وسیم صاحب! خدا کے لئے اتنے سنگدل اور بے رحم نہ بنئے اور مجھے بھری مجلس میں اس طرح ذلیل نہ کیجیے۔ میں اتنے لوگوں کے سامنے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد مکان فروخت کرکے باقی تین ہزار روپے ادا کردوں گا۔"

"کریم میاں! میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی لڑکی کی شادی میرے لڑکے کے ساتھ ہو جائے اور آپ کو ایک تعلیم یافتہ داماد مل جائے تو وعدے کے مطابق پورے پانچ ہزار روپے نکالئے ورنہ کسی قیمت پر یہ شادی نہ ہو سکے گی۔"

کریم میاں وسیم صاحب کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگے۔ لیکن پتھر کے اندر کوئی احساس بیدار نہ ہو سکا۔

"یہ شادی نہیں ہوگی۔"

وسیم صاحب نے کھڑے ہو کر چیختے ہوئے کہا۔

"ہمارے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ پانچ ہزار دینے کا وعدہ کرکے صرف دو ہزار دے رہے ہیں!"

غیر متوقع طور پر یہ اعلان سنتے ہی براتوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان کانا پھوسی ہونے لگی۔

'جب پانچ ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے تو اب دیتے کیوں نہیں؟'

'غیر مسلموں کی طرح تلک لیتے ہوئے شرم نہیں آتی'

لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ اسی وقت ایک بچے نے گھر کے اندر سے ایک سلپ لا کر کریم میاں کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے سلپ لے کر دیکھا۔ اُن کی لڑکی شکیلہ کی تحریر تھی ——

"ابا حضور!

میں ایسے لالچی اور خود غرض باپ کے بیٹے سے شادی نہیں کر سکتی جو آپ کی اتنی بے عزتی ہونے پر بھی پتھر کی طرح خاموش ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح لالچی اور خود غرض ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی کس طرح گزار سکوں گی جو اتنا خود غرض اور کم ظرف ہے۔!؟

آپ کی بدنصیب بیٹی

شکیلہ"

خط پڑھ کر کریم میاں غم سے نڈھال ہو گئے۔ اُن کی پلکوں پر بے بسی کے دو آنسو لرز اٹھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر دیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"دیم صاحب! آپ کو شرم آنی چاہئے کہ آپ غیر مسلموں کی طرح اُمت محمدی میں تلک کا رواج قائم کر کے پورے اسلامی معاشرے کو زہر آلود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ مرض ہمارے معاشرے میں پھیل گیا تو غریبوں کی لڑکیاں تلک کے بھاری بوجھ تلے دب کر رہ جائیں گی اور ہاتھوں میں مہندی رچانے کا ارمان اُن کے سینوں میں گھُٹ کر رہ جائے گا۔ اور جس طرح بھرے ہوئے دریا کا باندھ ٹوٹ جانے پر ہر طرف تباہی اور بربادی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب ان سسکتی ہوئی کنواریوں کے جذبات کا لاوا اُبلے گا تو ہر طرف شعلے بھڑک اٹھیں گے اور کتنے ہی لوگوں کے گھر ان شعلوں میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔ اس لئے ان تباہیوں اور بربادیوں کو روکنے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم تلک کے اس غلط رواج کو اپنا کر اپنے معاشرے میں برائی پیدا نہ ہونے دیں۔ بھائیو —— کیا آپ لوگ اس کے لئے

تیار ہیں! ؟"

"ہاں، ہم لوگ اس کے لئے تیار ہیں۔ ہم تلک لینے والوں کا سوشل بائیکاٹ کریں گے!"

نوجوان کے جذبات بھرے لہجے سے مسحور ہو کر اکثر لوگ چیخ اٹھے اور کچھ لوگ نفرت بھری نگاہوں سے وسیم صاحب کی طرف گھورنے لگے۔

"اب آپ لوگ یہ بتائیں کہ اس سنگدل اور خود غرض انسان کے لئے آپ لوگوں کا کیا فیصلہ ہے؟"

اسی نوجوان نے سوال کیا۔

"اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہ فوراً یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکل جائے اور آئندہ کسی لڑکی کے مجبور باپ سے جہیز یا روپیوں کا مطالبہ نہ کرے ورنہ اس کے شایانِ شان اسے گدھے پر سوار کر کے اور چہرے پر کالک مل کے پورے شہر میں جلوس نکالا جائے گا!"

دوسرے نوجوان نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور اکثر لوگوں نے تالیاں بجا کر اس خیال کی تائید کی۔ ماحول کی سنگینیت کو محسوس کر کے وسیم صاحب اپنے لڑکے کو لے کر رخصت ہو گئے۔ براتیوں میں سے کچھ ہی لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اکثر براتی شامیانے ہی میں بیٹھے رہے۔

"اب میری لڑکی کا کیا ہوگا ۔۔۔! ؟"

کریم میاں جو حیرت سے یہ واقعات دیکھ رہے تھے، بے حد پریشانی کے عالم میں چیخ اٹھے۔

"کیا ہمارے درمیان کوئی ایسا نوجوان نہیں جو خلوص کے ساتھ بن بیاہی دلہن کو اپنا سکے۔! ؟"

پہلے نوجوان نے سوال کیا۔ لیکن لوگوں پر اس طرح خاموشی چھائی رہی جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا جیسے کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہو۔ نوجوان نے مایوس ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو کریم میاں نے بے چین ہو کر اُس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس کی طرف گھورتے ہوئے کہا ــــــ

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم کسی خاص جماعت کے آدمی معلوم ہوتے ہو اور اپنے مخصوص نظریات کی اشاعت چاہتے ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ میرے دینی بھائی ہیں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں کسی مخصوص جماعت سے کبھی تعلق نہیں رکھتا۔ میں تو حضور صلعم کا پیروکار ہوں اور اسلامی معاشرے میں پھیلتے ہوئے تلک کے غلط رواج اور جہیز اور بڑی بڑی رقموں کے مطالبے کے خلاف ہوں۔"

نوجوان نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ اس ایثار کے لئے تیار ہیں؟"

مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہوں۔ ایک مومن کے قول اور فعل میں یکسانیت ہونی چاہئیے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ میں ایک مقامی ہائی اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اگر آپ میرے حالات معلوم کرنا چاہیں تو میں اپنا پتہ بتا دیتا ہوں۔"

"ہم آپ کو جانتے ہیں۔ اب ہمیں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔"

کریم میاں کے لڑکے نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرے دن جلال دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے قدموں سے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ انجانی دلہن کی خوبصورت آنکھوں میں انتظار اور خلوص و محبت کی تیز چمک تھی۔ اس نے دلہن کو بے حد جذباتی انداز میں سلام محبت پیش کیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔

یکایک چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور جلال کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

(ساقی، آسنسول مارچ ۱۹۷۰ء)

ڈوبتے سورج کا کرب

لاش کا تھپڑ

چاندنی کی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر پڑی تھی۔ اُس کے ادھیڑ عمر کے شوہر رحمٰن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ خوف و دہشت سے اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور سر کے بال پاگلوں کی طرح بکھر گئے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے جب وہ کمرے سے باہر گیا تو چاندنی اچھی بھلی تھی اور ان دونوں میں نوک جھونک بھی ہوئی تھی۔ چاندنی ضد کر رہی تھی کہ وہ اسے ابھی وقت اُس کی ماں کے یہاں پہنچا دے۔ وہ فاقے کرتے کرتے تنگ آ چکی تھی اور اب ہمیشہ کے لئے اُسے چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلی جانا چاہتی تھی۔

لیکن وہ کیا کرتا؟ وہ بھی تو دو دنوں سے بھوکا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے وہ صرف دوستوں کی پلائی ہوئی چائے اور سگریٹ پر زندہ تھا۔ بھوک سے اُس کا بُرا حال تھا۔ لیکن پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لئے اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کا ہوٹل دو دن سے بند تھا۔ گوالے نے وقت پر پیسے نہ ملنے کی وجہ سے پہلے بھی اُسے دودھ دینا بند کر دیا تھا۔ لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح اُس نے گوالے کو راضی کر لیا تھا مگر اِس بار تو اُس کا دل بھی نہ پسیجا اور وہ بھی دوسروں کی طرح پتھر بن گیا۔

ہر دروازہ اس کے لئے بند ہو چکا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے کاہل اور ناکارہ سمجھ کر الگ کر دیا تھا۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ اپنے باپ کی شاندار حویلی کو چھوڑ کر اس بستی میں کرائے کے چھوٹے کمرے میں اپنی بیوی چاندنی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ باپ سے الگ ہو کر شروع میں اُسے کسی بات کی کوئی تکلیف

نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا جس میں ہر وقت گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اُس کی نوجوان بیوی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے پکوڑے اور سموسے کھا کر لوگ تعریفیں بھی کرتے جاتے تھے اور کنکھیوں سے سامنے کھڑکی کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے جہاں کبھی کبھی چاندنی کی جھلک بجلی کی طرح کوند کر غائب ہو جایا کرتی تھی۔

اُس چھوٹی سی بستی میں اور بھی کئی چائے خانے تھے۔ لیکن اُس کے ہوٹل کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اُس نے ہوٹل کی آمدنی سے اپنے چھوٹے سے کمرے میں بجلی کا پنکھا بھی لگوا لیا تھا اور بڑے چاؤ سے چاندنی کے کانوں کے لئے جھمکے اور گلے کے لئے نیکلس بھی بنوا دیے تھے۔ اُن کی زندگی آسودگی اور سکون کے ساتھ گزر رہی تھی کہ ایک دن ایک چھوٹے سے واقعہ نے اُن کی زندگی کی پُر سکون جھیل میں تلاطم پیدا کر دیا۔

اُس دن ایک نیا گاہک جمن کو باتوں میں لگا کر 'اڈے' پر لے گیا۔ وہاں پہنچ کر جمن نے دیکھا کہ مختلف عمروں اور مختلف شکلوں کے کچھ لوگ باری باری چلم ہاتھ میں دبا کر زور سے کش لگا رہے تھے۔ اُسے اُس کی بو بہت بری معلوم ہوئی اور اُس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن اُس نئے گاہک نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے وہیں بٹھا دیا۔ اُسی وقت اُس 'اڈے' کی مالکن کی نوجوان لڑکی اپنے حسن و شباب کی بجلیاں گراتی ہوئی آئی اور اُس نے تازہ بھری چلم جمن کے ہونٹوں سے لگا دی۔ اُس نے غیر شعوری طور پر دونوں ہاتھوں میں چلم دبا کر لمبے لمبے کش لگانے شروع کر دیے! اور پھر یہ اُس کا روزانہ کا معمول ہو گیا۔

عورت اور گانجے نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ گانجے کے مہلک اثرات نے اُس کے سینے کو جھلس ڈالا۔ ہر دم نشے کی حالت میں رہنے کی وجہ سے وہ اپنے ہوٹل کی طرف سے بھی لاپروا ہو گیا۔ ہوٹل ہر دوسرے تیسرے دن بند رہنے لگا۔ گاہکوں کے ساتھ برتاؤ میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اگر کوئی چائے میں شکر کی کمی کی شکایت کرتا تو وہ بگڑ جاتا۔ اور اگر کوئی گاہک ادھار کے پیسے وقت پر ادا نہ کرتا تو وہ اُسے فحش گالیوں سے نوازتا۔

ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اُس کے گاہک آہستہ آہستہ بد دل ہو کر دوسرے ہوٹلوں میں جانے لگے۔

اور ایک وقت وہ بھی آیا جب اُس کے ہوٹل کا رخ کرنے والے گنتی کے صرف چند گاہک رہ گئے۔ یہ گاہک بھی وہ تھے جو چاندنی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے پکوڑے اور سموسے کھاتے کھاتے اب اُس کے حسن و شباب کا رس چوسنا چاہتے تھے۔

چاندنی اُن کے ارادوں سے بے خبر نہ تھی۔ لیکن وہ مشرقی ماحول میں پلی تھی جہاں شوہر کو مجازی خدا سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شوہر کی بری لت اور بے توجہی کے باوجود اس نے کسی نوجوان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آخر مایوس ہو کر اس کے چاہنے والے بھی دوسری جگہ جانے لگے اور ہوٹل بالکل ٹھپ ہو گیا۔ گھر کا اثاثہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ بجلی کا پنکھا بھی بک گیا۔ چاندنی کے جھمکے اور نیکلس بھی صاف ہو گئے۔ اسکے بعد کھانے پکانے کی پتیلیوں اور برتنوں کی باری آئی اور چھوٹا سا سجا سجایا کمرہ ویران ہو گیا۔

ہوٹل کئی بار کھلا اور بند ہوا۔ جمن نے ہوٹل چلانے کے لئے کس کس سے روپے نہ لئے، باپ بھائی، بہن سب ہی اسے روپے دے دے کر تنگ آ گئے۔ وہ ہوٹل چلانے کے لئے روپے لیتا اور گلبرگ کے طویل کشوں میں اُڑا دیتا۔ ہوٹل ایک دن کھلتا تو دو دن بند رہتا۔

جمن جانتا تھا کہ اب بھی کچھ دل پھینک نوجوان چاندنی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُس کے ہوٹل میں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر چاندنی چاہے تو اُن کی تکلیف اور مصیبت کے دن ختم ہو سکتے ہیں۔ اُس نے بارہا چاندنی کو اس قسم کے اشارے بھی کئے۔ لیکن چاندنی جیسے جان کر بھی انجان بنی رہی۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے ایک دن اُس سے صاف صاف کہہ ہی دیا کہ زندہ رہنے کی بس ایک صورت رہ گئی ہے!

تھوڑی دیر پہلے جب چاندنی زندہ تھی تو اُس نے بہت دنوں کے بعد غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا تھا کہ مسلسل فاقوں کے باوجود چاندنی کے جسم میں پوری جاذبیت

نر جو دھی۔ اُس کے جسم کے خوب صورت خطوط پوری طرح نمایاں تھے۔ رخساروں کے گلاب تر و تازہ تھے اور کولھوں اور سینے کے ابھار دل میں ہلچل مچا کر دعوت دیتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ بس ذرا سے میک اپ کی ضرورت تھی۔

جب اُس نے چاندنی سے کہا کہ وہ مناسب میک اپ کرلے اور کوئی اچھی سی ساڑی باندھ لے کیونکہ آج رات اس کا ایک نیا دوست آنے والا ہے تو چاندنی یکایک چونک اٹھی۔ اندر ہی اندر خوف سے اس کی روح چیخ اٹھی اور اس کی ریشمی پلکوں پر بے بسی کے دو آنسو لرزنے لگے۔ اس نے بہت منت سماجت کی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ لیکن وہ نہ مانا اور ضد کرتا رہا۔ اس بار زندگی میں پہلی بار چاندنی نے بے قابو ہو کر اس کے مکروہ چہرے کو اپنے تیز ناخنوں سے کھرچ ڈالا۔ جمن بھی بگڑ گیا۔ اُس نے اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر اُسے زور سے جھٹکا دیا اور چیختے ہوئے کہا ——

"حرام زادی! کھائے گی کہاں سے! دو روز سے بھوکی ہے۔ ماں باپ یا ساس سسر نے خبر لی کہ زندہ ہے یا مر گئی!"

پھر وہ اسے منہ ہاتھ دھو کر تر و تازہ ہو جانے کی ہدایت کر کے باہر چلا گیا۔

چاندنی سسک اٹھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مر جائے گی لیکن دوسروں کو کسی قیمت پر اپنے جسم کو ہاتھ نہ لگانے دے گی۔ اُس نے سوٹ کیس کھول کر ایسے ہی موقع کے لئے رکھی ہوئی خواب آور گولیوں کی شیشی نکالی پھر پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے جلدی جلدی کئی گولیاں نگل لیں۔ دو دن کے خالی پیٹ میں خواب آور گولیوں نے تیزی سے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

اُس کا گلاب سا چہرہ مرجھا رہا تھا۔

میں اپنے پر کشش چہرے کا بگاڑ بھی کر سکتی ہوں۔ بس تیزاب کے چند قطروں کی ضرورت ہوگی۔ پھر کبھی کی ہوسناک نگاہیں میرے جھلسے ہوئے چہرے کی طرف نہیں اٹھیں گی۔ لیکن اس دکھ بھرے سنسار

میں اس طرح گھٹ گھٹ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ؟ لوگوں کی ہوسناک نگاہیں، ایک وقت کھانا دو وقت فاقہ، کاہل اور ناکارہ شوہر کی آنکھوں میں خرید و فروخت کی مکروہ چمک ــــــ!

کیوں نہ ہمیشہ کے لئے جسم کے پنجرے سے بے چین اور بے بس روح کو آزاد کر دوں!؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس سے پہلے کہ سیتا کی پاکیزگی کسی راون کے ہاتھوں داغ دار ہو جائے مجھے روح کا پنجرا کھول دینا چاہئے.........'

بہکے ہوئے خیالات اُس کے ذہن میں بگولوں کی طرح گردش کر رہے تھے۔

خواب آور گولیاں تیزی سے کام کر رہی تھیں۔ اُس نے چند اور گولیاں نگل لیں تاکہ روح کا پنچھی جلد آزاد ہو جائے۔ اس کا سر تیزی سے گھومنے لگا۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ چارپائی پر گر پڑی اور چادر اپنے جسم پر تان لی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان کی جانب سے دو باہیں بلند ہو کر اسے پیار سے اپنی طرف بلا رہی ہوں۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو کر آسمان کی طرف اُڑ گئی ہو ....

اُسی وقت اُس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک اجنبی بھی تھا۔ نیا اور پہلا گاہک!

لیکن سیتا کی پاکیزگی اُس راون کے ہاتھوں داغ دار ہونے سے پہلے اُس کی روح کا پنچھی اُڑ چکا تھا!

شمع اور شمیا

نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۲ء

ڈوبتے سورج کا کرب

یاد کی خوشبو

توپ کا ایک گولہ میجر شہاب کے سامنے گر کر پھٹا اور دوسرے ہی لمحے اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔ جب اس کی موت کی خبر اس کی شریک حیات نسرین تک پہنچی تو شدت غم سے اس کی سسکیاں سینے میں گھٹ گئیں اور آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ کون جانتا تھا کہ شادی کے دو ہی سال بعد وہ اچانک بیوہ ہو جائے گی۔ وہ غم و الم کی تصویر بنی اپنی ویران آنکھوں سے خلاء میں گھورتی رہی۔ غم کی شدت کہیں اسے پاگل نہ بنا دے۔ غم کا اظہار ضروری ہے۔ یہ محسوس کر کے تعزیت کے لئے آئی ہوئی عورتوں میں سے ایک نے میجر شہاب کی تصویر میز پر سے اٹھا کر نسرین کے ہاتھوں میں تھما دی۔ میجر شہاب کا مسکراتا ہوا چہرہ سنہرے فریم میں سے جھانک رہا تھا۔ اس کے سیاہ گھنگھریلے بال چمک رہے تھے اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے مردانہ حسن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

نسرین کی نظر شہاب کی تصویر پر پڑی تو وہ بے چین ہو گئی اور اس نے ایک گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ تصویر کو اپنے بیتاب سینے سے لگا لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کے قطرے موتیوں کی طرح اس کی پلکوں سے ڈھلکنے لگے۔

جب وہ کچھ دیر رو چکی اور دل کا غبار آنکھوں کی راہ سے نکل گیا تو اس نے شہاب کی تصویر میز پر رکھ دی اور اپنی والدہ کی گود سے مرحوم شوہر کی آخری نشانی کو لے کر اسے پیار کرنے لگی۔ بچہ "ڈیڈی ڈیڈی" کہہ کر رونے لگا۔ وہ اپنی معصوم آنکھوں سے اپنے ڈیڈی کی تصویر کو گھور رہا تھا۔

"تمہارے ڈیڈی چلے گئے مُنّے! وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

اُس نے بچّے کو سینے سے بھینچتے ہوئے دردناک لہجے میں کہا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

ظفر اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکا اور اپنی بہن شہناز کو وہیں چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آ گیا۔ دوسرے دن کالج جاتے وقت جب وہ نسرین کے فلیٹ کے سامنے سے گزرا تو اُس نے دیکھا کہ وہ کمرے کے اندر سوگوار بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں شہاب کی تصویر دبی تھی اور وہ پُرنم آنکھوں سے تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی امّی دوسرے کمرے میں تھیں۔ ننھا معصوم منّا فرش پر بیٹھا رو رہا تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" ظفر نے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔

"آ جائیے!" نسرین نے اس کی جانب اُداس نظروں سے دیکھتے ہوئے بے حد سوگوار لہجے میں کہا۔

ظفر نے اندر آ کر مُنّے کو گود میں اٹھا لیا اور نسرین کے سامنے آ کر کہا۔

"جانے والے کی یاد میں اس طرح کب تک آنسو بہاتے رہئے گا؟ بھلا جانے والے کبھی لوٹ کر آتے ہیں!!"

"جانے والے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ لیکن اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی یادیں جو انسان کو تڑپاتی اور رُلاتی ہیں۔ اب تو رونا ہی میرا نصیب بن چکا ہے۔"

نسرین نے اپنے مرحوم شوہر کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسا نہ کہئے۔ آپ کو زندگی کی پوری رعنائیوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ اپنے مُنّے کے لئے، اپنے شوہر کی اس آخری نشانی کے لئے!"

ظفر نے بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حوصلہ بخش لہجے میں کہا۔

"ان کے بغیر تو زندگی موت سے بدتر ہے۔"

نسرین کی پلکوں پر دو آنسو لرز اٹھے۔

"ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیجئے اور ہمیں غیر نہ سمجھئے۔ مصیبت کے وقت پڑوسی ہی ایک دوسرے کے

کام آتے ہیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف شہناز سے کہہ دیجیے گا۔ اس وقت میں کالج جا رہا ہوں۔"

اُس نے نسرین کے سوگوار چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پرخلوص لہجے میں کہا اور منّا کو گود سے اتار کر باہر چلا گیا۔

شام کو جب وہ کالج سے واپس آ رہا تھا تو گرلس کالج کے گیٹ پر شاہدہ سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ پروفیسر مسز سکینہ بھی تھیں۔

"مسٹر ظفر! آپ نے تو ابھی سے اپنی منگیتر کی رکھوالی شروع کر دی ہے!"

مسز سکینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنے کالج سے واپس آ رہا تھا کہ یہ خود ہی مجھے مل گئیں!"

ظفر نے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"عشق صادق ہو تو منزل خود بخود سامنے آ ہی جاتی ہے۔ اچھا اب آپ انہیں سنبھالیے۔ میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی ایک رکشہ میں بیٹھ کر چلی گئیں۔

مسز سکینہ کے چلے جانے کے بعد ظفر اور شاہدہ ڈریم لینڈ ریسٹورینٹ میں داخل ہو کر ایک خالی گوشے میں جا بیٹھے۔ ظفر نے سینڈوچز اور چائے کا آرڈر دیا اور خاموش نگاہوں سے شاہدہ کی طرف دیکھنے لگا۔

شاہدہ نے اسی سال اردو میں ایم۔ اے کیا تھا۔ یونیورسٹی کے سارے طلبہ اور طالبات میں اس نے ٹاپ کیا تھا اور اس کے بعد ہی وہ مقامی گرلس کالج میں لکچرر ہو گئی تھی۔ شاہدہ نوجوان اور حسین تھی۔ وہ حسن و شباب کا ابھرتا آفتاب تھی! وہ حسن و رعنائی کی مسکراتی شفق تھی! اس کی سُرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی کنول جیسی آنکھیں اور سڈول جسم نے اسے بے حد خوبصورت بنا دیا تھا۔ اُس کی غزالی آنکھوں سے حسن و شباب کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ظفر جب اسے دیکھتا

تو سوچتا کاش! شاہدہ کی آنکھوں سے حُسن و شباب کی پھوٹتی کرنیں اس کے حریم حیات کو منوّر کردیں۔

جلد ہی اس کے اس خواب کی تعبیر اس کے سامنے آگئی ـــ شاہدہ اس کی منگیتر بن گئی!

اس کے والد ڈاکٹر اسحاق اور ظفر کے والد طاہر صاحب بچپن کے دوست تھے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ ظفر اور شاہدہ بھی جیون ساتھی بن جائیں۔

وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ ظفر جسم تھا تو شاہدہ اُس کی روح تھی۔ وہ پھول تھا تو شاہدہ اُس کی خوشبو تھی!

بیرا میز پر سینڈوچ کی ڈشیں سجا کر چلا گیا۔ ظفر نے وہ ڈشیں شاہدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ!"

"میں کھاؤں؟ اور آپ نے ـــ!؟"

"میرا جی کچھ کھانے کو نہیں چاہتا۔ مسز شہاب کا غم مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ شوہر کی اچانک موت کی وجہ سے اُس کا غم سے بُرا حال ہے۔" "اوہ! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں تو نہ جانے کیا کیا سوچنے لگی تھی!"

"کیا سوچنے لگی تھیں!؟"

"اب جانے بھی دیجئے۔ کھائیے ورنہ چائے ٹھنڈی ہی پینی پڑے گی!"

شاہدہ کے بہت اصرار کرنے پر ظفر نے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور بے دلی سے کھانے لگا۔ اتنے میں بیرا چائے لے کر آگیا۔

چائے پی لینے کے بعد ظفر نے بل ادا کیا اور شاہدہ کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ سامنے سے گزرتی ہوئی خالی ٹیکسی کو روک کر دونوں اُس میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی صاف و شفاف سڑک پر اس طرح دوڑنے لگی جیسے پارہ ہاتھ سے چھوٹ کر تیزی سے پھسلتا جائے۔

'آشیانہ' کے سامنے ٹیکسی رکوا کر ظفر نے شاہدہ کو خدا حافظ کہا اور ڈرائیور کو ہدایت دے کر مسز شہاب

کے پُر درد المیہ کے متعلق سوچنے لگا۔

گھر پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کئے اور جب اُسے معلوم ہوا کہ شہناز مسز شہاب کے پاس بیٹھی ہے تو وہ بھی وہیں چلا گیا۔

کمرے میں شہناز، مسز شہاب اور اُس کی والدہ بیٹھی تھیں۔ منّا کمرے کے فرش پر ایک آٹومیٹک بھالو

کو ناچتے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہا تھا۔

"شہناز! تم انہیں کچھ کھلانے پلانے میں کامیاب ہو سکیں یا نہیں؟"

ظفر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"صبح کے وقت بہت اصرار کرنے پر خالہ جان اور باجی نے دو چار لقمے کھائے تھے۔ دوپہر کا کھانا خالہ

جان نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اپنے یہاں بنائیں گی۔"

شہناز نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

"دیکھئے آپ ہمیں غیر نہ سمجھئے۔ میجر شہاب میرے دوست ہی نہ تھے وہ میرے لئے ایک شفیق بھائی کا درجہ

رکھتے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں اگر آپ لوگوں کو کسی طرح کی تکلیف ہوئی تو یہ میرے لئے بڑے دکھ اور شرم

کی بات ہوگی۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس فلیٹ کو چھوڑ کر میرے فلیٹ میں آجائیں اور مل جل

کر ایک خاندان کی طرح زندگی کے باقی دن گزار دیں۔"

ظفر نے نسرین اور اُس کی امّی کی طرف دیکھتے ہوئے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

مسز شہاب نے خاموش نگاہیں اٹھا کر ظفر کی طرف دیکھا۔ اُس کے سوگوار چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

اُس کا حسین چہرہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح مرجھا گیا تھا اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں

میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے ظفر کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ لیکن اس کے لب کانپ کر رہ گئے

اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

کمرے کے اداس اور بوجھل ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"بیٹا ظفر! میں تمہارے خلوص اور ہمدردی سے بیحد متاثر ہوں۔ لیکن ہم لوگ تمہارے اوپر ہرگز بار نہ بنیں گے ہم جلدی ہی اپنے وطن واپس چلے جائیں گے"۔

نسرین کی امّی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"خالہ جان! آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ لیکن آپ سے یہی گزارش ہے کہ آپ کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو مجھے اپنا سمجھتے ہوئے بلاتکلف بتا دیا کریں۔ فی الحال گھر کے اخراجات کے لئے آپ یہ رکھیں۔"

ظفر نے سو سو کے دو نوٹ جیب سے نکال کر نسرین کی امّی کے سامنے رکھتے ہوئے پرخلوص لہجے میں کہا۔

"بیٹا ظفر! یہ کیا کر رہے ہو؟ مجھے اسوقت روپے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں یہ روپے نہیں لے سکتی۔"

انہوں نے سامنے پڑے ہوئے دونوں نوٹ اٹھا کر ظفر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان! مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے غیر سمجھ کر میرے نوٹ واپس کر رہی ہیں۔"

ظفر نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں بیٹا! اسطرح نہ سوچو۔ میں تمہیں غیر نہیں سمجھتی۔" انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر آپ یہ نوٹ رکھ لیں۔ ضرورت کے وقت کام آئیں گے"۔

ظفر نے سو سو کے دونوں نوٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور اس کے خلوص سے متاثر ہو کر انہوں نے دونوں نوٹ رکھ لئے۔

ظفر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے کھیلتے ہوئے مُنّے کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر اس نے جیب سے ٹافیوں کا ایک پیکٹ نکال کر مُنّے کو دیا۔ مُنّا ٹافیوں کا پیکٹ پا کر خوشی سے کھل اٹھا۔

ظفر نے مُنّے کو پیار کر کے اسے گود سے نیچے اتار دیا اور شہناز کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن شہناز مس شاہدہ سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ وہ ان سے ملنے کے لئے کالج کے اسٹاف روم

بس گئی۔ لیکن اس وقت تک مس شاہدہ کالج نہیں آئی تھیں۔ وہ اُن سے ملنے کے لئے کالج کے اسٹاف روم سے نکل ہی رہی تھی کہ دروازے پر مس شاہدہ سے ٹکر ہو گئی۔

"اب ایسی بھی بے خودی کیا کہ اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہے!"

مس شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم ویری سوری میڈم۔ میں آپ ہی کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔"

شہناز نے اپنا آنچل درست کرتے ہوئے کہا اور جھک کر گری ہوئی کتابیں سمیٹنے لگی۔

"میری تلاش میں! کیوں خیریت تو ہے؟ بھئی سنا ہے تمہارے بھائی جان ان دنوں مسز شہاب اور ان کی امی پر بہت مہربان ہیں!"

مس شاہدہ نے مسکراتے ہوئے بظاہر اطمینان بھرے لہجے میں کہا لیکن اُن کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور رشک کا خوفناک دیو ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

شہناز مس شاہدہ کو ایک گوشے میں لے گئی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اسٹاف روم میں بیٹھی ہوئی پروفیسر مسز سکینہ اور مسز بنرجی کی توجہ ان کی طرف نہیں ہے تو اس نے مس شاہدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کے لہجے میں کہا ——

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ کل ہی بھائی جان نے انہیں اخراجات کے لئے دو سو روپے دیے ہیں اور انہیں آفر (offer) کیا ہے کہ وہ لوگ ہمارے فلیٹ میں آجائیں اور ایک ہی خاندان کی طرح رہیں۔"

شہناز کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ اس کا جملہ ختم ہوتے ہی مس شاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ بے چینی سے اپنا گلا سہلانے لگیں۔

"اُف! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟"

اچانک مس شاہدہ کو اداس اور بے چین دیکھ کر شہناز گھبرا اٹھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں چکر سا آگیا ہے۔ پیاس سے گلا خشک ہو رہا ہے۔"

مس شاہدہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور آرام چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

"آپ گھبرائیے نہیں۔ میں فوراً صراحی میں سے پانی لے کر آتی ہوں۔"

شہناز یہ کہتی ہوئی تیزی سے اسٹاف روم کے دوسرے کنارے تک گئی اور گلاس میں پانی ڈھال کر لے آئی۔

پانی پی لینے کے بعد مس شاہدہ نے اپنے لبوں اور آنکھوں کو رومال سے خشک کیا اور ڈائری کھول کر ظفر کے نام ایک مختصر سا خط لکھا۔ خط لکھ لینے کے بعد انہوں نے بیون کے ذریعہ آفس سے ایک لفافہ منگوایا اور خط اس میں رکھ کر بند لفافہ شہناز کے حوالے کرتے ہوئے کہا ——

"اسے ظفر صاحب کو دے دوگی!"

شہناز نے حیرت بھری نگاہوں سے مس شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اسٹاف روم سے باہر چلی گئی۔

شام کے وقت گھر واپس پہنچ کر شہناز نے ظفر کو مس شاہدہ کا لفافہ دیا۔ اُس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگا ——

"ظفر صاحب!

ہماری زندگی ہم سے قربانی مانگتی ہے۔ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ مسز شہاب ہر لحاظ سے ہمدردی کی مستحق ہیں۔ انہیں سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر انسانی ہمدردی کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں اور آپ کی کامیابی کے لئے آپ کی نظر دُعا

بہت دور جا رہی ہوں۔

حرماں نصیب

"شاہدہ"

خط پڑھ کر ظفر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکے اندر بارود کی سرنگیں بچھا دی ہوں اور تیز دھماکوں سے اس کے دل و دماغ کے پرخچے اُڑ رہے ہوں۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے فلیٹ سے نیچے اُترا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر "آشیانہ" پہنچ گیا۔ لیکن شاہدہ وہاں نہ تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ شاہدہ ایرپورٹ جا چکی ہے تو وہ بے چین ہو گیا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آ جانا چاہتا ہو۔ ہموار سڑک پر ٹیکسی پوری رفتار سے بھاگنے لگی اور جب ظفر ایرپورٹ پہنچا، پلین رن وے (Run Way) چھوڑ چکا تھا اور آہستہ آہستہ اوپر کی جانب اٹھنے لگا تھا۔

یکایک ظفر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل کسی ننھے پرندے کی طرح زخمی حالت میں اس کے سینے میں پھڑپھڑا رہا ہو!

ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ کربناک آواز میں چیخ اٹھا —

"شاہدہ! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسز شہاب میری بہن کے برابر ہیں! واپس آ جاؤ شاہدہ، واپس آ جاؤ —!"

وہ ریلنگ کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے غم کی شدت سے چیختا رہا۔ لیکن اس کی درد بھری آواز شاہدہ کے کانوں تک نہ پہنچ سکی اور پلین ایک سیاہ نقطے کی طرح اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا!

شاہدہ ظفر سے دور چلی گئی۔ لیکن وہ اپنی یاد کی خوشبو چھوڑ گئی۔ ظفر کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاہدہ اب بھی اسکے پاس ہے۔ اسکے ساتھ گزرے ہوئے حسین لمحات کی خوشبو ہر طرف بکھری ہوئی ہے!

•••

— سالنامہ بیسویں صدی، دہلی، جنوری ۱۹۷۳ء

ساحل نہیں ملتا..........

اس دن پھر صبح سویرے ہی عورتوں کے درمیان تکرار ہو رہی تھی!

رات دیر سے سونے کی وجہ سے میری پلکیں نیند سے بوجھل تھیں۔ گرمی سے در و دیوار بھی تپ گئے تھے۔ الیکٹرک فین سے گرم ہوا نکل رہی تھی اور کمرے میں حبس تھا۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ اس وقت عورتوں کی چیخیں کانوں میں گونجیں تو میں بھی نیند سے جاگ پڑا اور آنکھیں ملتا ہوا آنگن کی طرف بڑھا۔ سامنے کنوئیں پر عورتیں جمع تھیں اور ان میں پانی کے لیے جھگڑا ہو رہا تھا۔

"تم نے پورا کنواں ہی خالی کر دیا۔ اب باقی عورتیں کیا سرکاری نل سے پانی لینے جائیں گی!؟"

میری خالہ نے مکان کی مالکہ کی حیثیت سے تحت طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"پانی تو میں نے دو ہی بالٹی بھرا ہے۔ دراصل آج کنوئیں میں پانی جمع ہی نہیں ہوا۔"

نئی کرایہ دار نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ آنگن کی دوسری کرایہ دار عورتوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ گھبرائی ہوئی تھی اور ان کے درمیان تماشہ بن جانے پر روہانسی سی ہو رہی تھی۔

"خالہ جان! آپ بھی کیا صبح صبح پانی کا حساب لینے بیٹھ گئیں۔ بے چاری کو پانی کی ضرورت تھی۔ اگر ایک آدھ بالٹی زیادہ لے لیا تو اس سے کیا بگڑ گیا۔ دیکھئے گھٹا چھا رہی ہے۔ بارش ہو جائے تو ہر طرف پانی ہی پانی ہو گا!"

میں نے معاملہ کو رفع دفع کرنے کے خیال سے کہا۔

"تو جا اپنا کام کر بڑا آیا طرف دار بن کر ۔۔۔!"

خالہ جان نے میری مداخلت پر مجھے جھڑکتے ہوئے کہا اور میں نادم سا ہو کر باہر چلا گیا۔

نئی کرایہ دار بے حد حسین تھی۔ سنگ مرمر جیسا اس کا جسم حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی رنگت ایسی تھی جیسے مکھن میں ہلکا سا گلابی رنگ گھول دیا گیا ہو۔ اس کی چال میں بلا کی مستی تھی۔ جب وہ چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم کا ایک ایک عضو تھرک رہا ہو اور اس کے انگ انگ سے حسن و شباب کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔

میرے خالہ زاد بھائی خالد نے مجھے بتایا کہ جب صبا (نئی کرایہ دار) کے چاہنے والے نے ایک بے جان کھلونے کی طرح ٹھکرا کر ایک امیر زادی اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر لی تو اس کے غریب والدین نے اسے ایک بے زبان گائے کی طرح اس کی عمر سے تین گنی زیادہ عمر کے بوڑھے کے کھونٹے سے باندھ دیا تاکہ عشق میں ناکامی کے بعد کوئی دوسرا نوجوان غلط طور پر اس کی ہمدردی نہ حاصل کرے اور کہیں اس کے قدم بہک نہ جائیں!

صبا کی دکھ بھری داستان سن کر مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہوئی اور کسی انجانے جذبے کے تحت میں نے اپنے آپ کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا۔

اس دن شام کو جب میں دفتر سے واپس آنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے کے لیے کنوئیں پر گیا تو صبا وہاں پہلے سے موجود تھی اور برتن مانجھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے خوبصورت لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھل اٹھی اور جھیل جیسی گہری آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔

"آج صبح والے واقعے پر آپ کی ہمدردی کا شکریہ!"

اس نے اپنی ریشمی پلکیں اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا بڑے میاں آپ کے شوہر ہیں!؟"

میں نے دانستاً اُس کے بوڑھے شوہر کا ذکر چھیڑ کر اُس کے چہرے پر اُبھرتے ہوئے دلی جذبات کو پڑھنا چاہا۔

لیکن میرا سوال سن کر اس کے حسین چہرے پر دھواں سا چھا گیا اور اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

اُس کی ریشمی پلکوں پر دو آبدار موتی لرز اُٹھے اور وہ دھوئے ہوئے برتن سمیٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

سامنے سے خالہ جان کو آتے ہوئے دیکھ کر میں جلدی جلدی منھ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

"نسیم! تم اسے زیادہ منھ نہ لگاؤ۔ شاید تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے!"

خالہ جان نے پیار بھرے لہجے میں مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"روزانہ شام ہوتے ہی اس کے سر پھرے عاشق کھڑکی کے سامنے منڈلانے لگتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے ہی یہ معلوم ہوتا تو میں اسے ہرگز کرایہ پر کمرہ نہ دیتی!"

"خالہ جان! اگر کچھ اوباش نوجوان اس کی کھڑکی کے سامنے منڈلایا کرتے ہیں تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے!؟" میں نے صبا کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"نسیم! تم خواہ مخواہ اس 'بے چاری' سے ہمدردی نہ جتاؤ۔ میں نے اس کے شوہر سے کہہ دیا ہے کہ میری بہو آ رہی ہے۔ اسلئے وہ جلد سے جلد کمرہ خالی کر دے۔"

"بہو ۔۔۔ !؟ لیکن ابھی تو خالد بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی!!" میں نے متحیر لہجے میں کہا۔

"میں نے تمھاری بیوی کو یہاں آنے کے لیے لکھ دیا ہے!"

انھوں نے آنگن میں بندھی ہوئی الگنی پر سے سوکھے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبا دور ہی سے میرے اوپر اپنی مسکراہٹوں کے جال پھینکتی رہی اور میں اُس جال میں ایک بے بس مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ اُس کی مسکراہٹوں کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے ناآسودہ جذبات ہی نے اُسے میری طرف مائل کیا ہوگا!

ایک دن میں برآمدے میں لیٹا ہوا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے بچے نے ایک رقعہ

لاکر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ لکھا تھا۔

"حامل رقعہ کے بدست رسالہ بھیج دیں۔ پڑھ کر واپس کر دوں گی۔"

"یہ رقعہ تمہیں کس نے دیا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں بچے سے سوال کیا۔

اُس نے منھ سے کچھ نہ کہا لیکن سامنے کی طرف انگلی اُٹھا کر مسکرانے لگا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے صبا کھڑی تھی۔ غالباً کچھ ہی دیر پہلے وہ غسل کر کے اٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر ناگن کی طرح لہرا رہے تھے۔ اُس کا اُمڈتا ہوا شباب دیکھ کر اچانک میرے جذبات میں ہلچل سی مچ گئی اور میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے ایک خشک پتے کی طرح اندر ہی اندر کانپنے لگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسالہ بچے کے حوالے کر کے میں نے اُس رہزنِ ہوش کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔

دوسرے دن جب میں دفتر سے واپس آ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا تو وہ بچہ رسالہ لے کر آ گیا۔ میں رسالہ اُس کے ہاتھ سے لے کر یونہی ورق گردانی کرنے لگا تو یکایک اُس کے اندر سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکل آئی۔ تصویر اُسی رہزنِ ہوش و تمکین کی تھی۔ بے حد حسین۔ سنگِ مرمر کا حسین مجسمہ! میرا دل دھڑک اٹھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور نگاہوں کے سامنے خوشنما رنگ بکھر گئے۔ جس طرح ایک ننھا منا بچہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر اُسے اپنی باہوں میں لینے کے لئے ہمکتا ہے۔ اُسی طرح میرا دل بھی سنگِ مرمر کے اُس جیتے جاگتے حسین بت کو حاصل کرنے کے لیے مچل اٹھا! لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ہی میری وفا شعار شریکِ حیات شاہدہ کا مسکراتا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے اُبھر آیا۔ میں نے کمزور اور بہکے ہوئے خیالات کو ذہن کے پردے سے جھٹک ڈالا۔ مچلتی ہوئی آوارہ خواہشوں کا طوفان تھم گیا۔ اور میں نے اُسی وقت اُسی بچے کے ذریعے صبا کی تصویر واپس کر دی۔

رات تو کسی طرح گزر گئی۔ لیکن صبح میرے لیے بڑی دھماکہ خیز ثابت ہوئی۔

آنگن میں عورتوں کی بھیڑ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے جب میرے اوپر حقیقت کا انکشاف

ہوا تو اچانک ایسا لگا جیسے میں نے انجانے میں بجلی کا ننگا تار چھو دیا ہو۔

صبا بھاگ گئی۔ اپنے ناآسودہ جذبات کی آسودگی کے لئے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا ذمّہ دار کون ہے؟ صبا کے والدین جنھوں نے ایک نوخیز کلی کو ایک عمر رسیدہ بوڑھے سے بیاہ کر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی یا وہ معاشرہ جس میں پلا بڑھا ہوا نوجوان غربت اور افلاس میں پلی ہوئی لڑکی کو دلہن بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن اُس کے جذبات کو ابھار کر اُسے بھگا لے جانے میں فخر محسوس کرتا ہے!!

ماہنامہ ترنّم، لکھنؤ

۲۲ مئی ۱۹۷۴ء

ڈوبتے سورج کا کرب

سارے بتوں کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ انکی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں اور وہ خشمگیں نگاہوں سے اسطرح بڑے بت کو گھور رہے تھے جیسے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے یا اپنی نگاہوں کی بجلیوں سے اسے جلا کر راکھ کر ڈالیں گے۔ بڑے بت کی پیشانی سے بھی لہو کی سرخ دھاریں پھوٹ کر چہرے پر پھیل رہی تھیں جس سے اس کا چہرہ اور خوفناک ہو گیا تھا اور وہ انگاروں جیسی آنکھوں سے اپنے ماتحت بتوں کی طرف گھور رہا تھا۔

میدان میں پجاریوں کا شور گونج رہا تھا۔ وہ بپھرے ہوئے انداز میں چیخ رہے تھے۔
"ہمیں سکھ اور شانتی چاہئے۔ ہمیں ایسے دیوتاؤں کی ضرورت نہیں جو آپس ہی میں لڑتے ہوں۔ ہمارا بڑا دیوتا ہمیں واپس کر دو جو ہم سے پیار کرتا تھا۔ ہمیں نفرت نہیں محبت چاہئے۔۔۔ محبت چاہئے۔۔۔"

پجاریوں کا شور سن کر بڑا بت اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اسے پجاریوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر دوسری طرف سے کئی چھوٹے بت بھی آگے بڑھے۔ پجاریوں کے سامنے پہنچ کر بڑے بت نے اپنے چہرے پر ہاتھوں کو پھیرا تو گرم اور سرخ لہو میں اس کے ہاتھ رنگ گئے۔ اس نے خون میں رنگے ہوئے ہاتھ مجمع کی طرف بلند کرتے ہوئے پجاریوں کو پُر امن رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔۔۔

"میں تم لوگوں کا دشمن نہیں۔ میں تمہاری بھلائی اور کامیابی کے لئے یہاں آیا تھا۔

لیکن تمہارے سکھ اور شانتی کے لئے میں نے جو بھی قدم اٹھایا اسے اِن بتوں نے سبوتاژ کر دیا۔ ان لوگوں نے تمہیں میرے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور۔ ...... "

" ڈھونگی دیوتا مردہ باد! "

" ڈھونگی دیوتا واپس جاؤ! "

مجمع کے سامنے کھڑے ہوئے دو قد آور بت یکایک زور سے نعرے لگانے لگے۔ بڑا بت خونخوار نگاہوں سے انہیں گھورنے لگا اور مجمع نے بیزار ہو کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ جب دونوں قد آور بت خاموش ہوئے تو مجمع میں سے کچھ لوگوں نے چیختے ہوئے کہا ــــ

" ہمیں اب کسی پر اعتماد نہیں۔ ہم اب کچھ سننا نہیں چاہتے۔ ہمیں یہ روشنی نہیں چاہیے۔ ہمارے اندھیرے ہمیں لوٹا دو۔ ہمارا بڑا دیوتا ہمیں واپس لا دو جو ہم سے پیار کرتا تھا۔ ہمیں نفرت نہیں محبت چاہیے ــــ ہمیں محبت چاہیے۔ "

مجمع جوش و جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے نعرے لگانے لگا۔ کچھ لوگ نعرے لگاتے ہوئے بڑے بت کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ لوگ چھوٹے بتوں کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے یہ تیور دیکھ کر سارے بت سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر دبک گئے۔ اسی وقت مجمع میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور مشتعل پجاریوں کے سامنے آ کر بولا ــــ

" بھائیو! ان بتوں سے کچھ نہ ہوگا۔ آؤ ہم سب اپنے بڑے دیوتا کو مل کر منائیں اور انہیں یہاں لے آئیں۔ "

یہ سن کر مجمع خوشی سے تالیاں بجانے لگا اور سب لوگ نعرے لگاتے ہوئے اس شخص کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

اور جب وہ لوگ اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو منانے کے لئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے اس وقت آگ کی طرح دہکتا ہوا سورج ڈوب رہا تھا۔ پجاریوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے بال بکھر گئے تھے۔ اور آنکھیں دھول اور سورج کی گرمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ تھک کر چور چور ہو گئے تھے۔

لیکن اپنے بڑے دیوتا کو دیکھتے ہی ان کے چہرے کھل اٹھے اور وہ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ نعروں کی آواز سن کر بڑے دیوتا نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے اتنا بڑا مجمع دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مجمع کی رہنمائی کرنے والے شخص نے بڑے دیوتا کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر گلوگیر آواز میں کہا۔

"عظیم چارہ گر! ہمارے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمارے بتوں نے ہماری رہنمائی کرنے کی بجائے تباہی کے غار میں دھکیل دیا ہے۔ امن اور شانتی کے پرچار کی بجائے وہ آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے خونخوار جبڑے کھول کر ہمارے جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لیں۔ اس لئے اے عظیم دیوتا! آپ ہمارے ساتھ چلئے اور ہمیں مصیبتوں سے نجات دلائیے۔"

مجمع خوشی سے بے قابو ہو کر نعرے لگانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو بڑے دیوتا نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں تم لوگوں کی دکھ بھری داستان سن کر بہت دکھی ہوں۔ میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عیار اور مکار دنیا سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھوں گا۔ لیکن تم لوگ مجھے اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے بضد ہو تو میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ لیکن اس شرط پر کہ میرے مالک مجھے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔"

بڑے دیوتا کی باتیں سن کر مجمع پھر خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ اسی وقت کچھ لوگ سنگتراش کو لانے چلے گئے۔ اور جب سنگتراش آیا تو بڑا دیوتا ادب اور احترام سے اس کے آگے جھک گیا۔

سنگتراش کے پیچھے پیچھے جب بڑا دیوتا اور پجاری شہر کے اندر داخل ہوئے تو لوگ پرجوش آواز میں نعرے لگانے لگے۔ سنگتراش کی معیت میں جب جلوس اپنی منزل پر پہنچا تو بڑا بت اور چھوٹے بت حیران رہ گئے۔ اسی وقت ایک پتھر بڑے بت کے سینے پر آ کر لگا اور وہ چکرا گیا۔ لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے آہنی پنجوں سے سنگتراش کے چہرے کو نوچ

کھسوٹ ڈالا۔ سنگتراش کے چہرے پر خون کی لکیریں کھنچ گئیں۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ اچانک ایک طرف سے کچھ نقاب پوش کچھ تابوت لئے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے سنگتراش اور دو فادآدر بتوں کو ان تابوتوں کے اندر بند کر دیا۔ اسی وقت کسی طرف سے ایک بڑا سا پتھر بڑے دیوتا کی پیشانی پر آ کر لگا۔ اس کی پیشانی سے لہو کی دھار پھوٹ نکلی اور دعا کیلئے اٹھے ہوئے اس کے ہاتھ نیچے جھول گئے!!

آہنگ، گیا

جولائی ۱۹۶۰ء

ڈوبتے سورج کا کرب

آواز کا کرب

اس رات مس رما کے اعزاز میں کلب میں اسپیشل پروگرام تھا۔

مس رما ایک مشہور اور دولتمند بزنس مین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ نئی نئی اس کلب کی ممبر بنی تھی جب کلب کے سب ممبر آگئے تو سبھوں سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ تعارفی رسم ختم ہوتے ہی ساگر کے دوستوں نے زبردستی اُسے پیانو کے سامنے بٹھا دیا۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے لوگوں کے چمکتے ہوئے چہروں کی طرف دیکھا۔

پھر اچانک پیانو پر ایک جھنکا سا ہوا اور اُس کی مچلتی ہوئی پُر سوز آواز لہرا اٹھی۔ وہ گاتا رہا اور مخمور جوانیاں بے خودی کے عالم میں جھومتی رہیں۔ دل دھڑکتے رہے اور ارمان مچلتے رہے۔ اور جب اُس نے گانا ختم کیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سبھوں کا شکریہ ادا کیا اور نگاہیں نیچی کئے ہوئے بالکونی پر چلا گیا۔

"آپ بہت اچھا گاتے ہیں!"

اچانک کسی کی رس گھولتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اوہ، آپ!"

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے مس رما دلربا انداز میں کھڑی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا اور پیشانی پر ناگن کی طرح ایک لٹ جھول رہی تھی۔

"مس رما! آپ کتنی حسین ہیں ــــ!"

اُس نے رما کے حسن و شباب سے متاثر ہو کے بے خودی کے عالم میں کہا۔ یہ سُن کر رما کا حسین چہرہ حیا سے

سرخ ہو گیا اور وہ جلدی سے نیچے اتر کر اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

رما سے اس کی دوسری ملاقات کلب ہی میں ہوئی۔ وہ اپنی مخصوص میز پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ رما شاخِ گل کی طرح ناز و ادا سے لچکتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ اور اس سے نگاہیں ملتے ہی وہ سیدھی اسی کی میز کی طرف آئی اور خوشی سے جھوم کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں کتنی چمک تھی! ساگر نے اُس کی نشیلی آنکھوں کی جھیل میں اپنے آپ کو ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ رما کے حسن کی تپش سے اُس کے اندر جذبات کی آندھی سی چلنے لگی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسی وقت ہال میں موسیقی گونج اٹھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے رما کی طرف دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر میز سے اٹھ گیا۔ رقص کے دوران رما کی خوبصورت آنکھوں سے شراب چھلکتی رہی۔ اور ساگر کے جذبات مچلتے رہے۔ یکایک اُس نے رما کی کمر کے گرد اپنی گرفت سخت کر لی اور اس کی نیم وا آنکھوں میں جھانکتا ہوا خوابناک لہجے میں بولا۔

"رما! دل چاہتا ہے اپنے مچلتے ہوئے وجود کو تمہارے وجود میں سمو دوں اور ہم دونوں ایک ہو جائیں!"

یہ سن کر رما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنی مخمور نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی نشیلی آنکھوں کے سحر میں کھو سا گیا۔ اس کے سارے جسم میں ایک سرور آمیز لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ رما کو اپنے بیتاب سینے سے چمٹا لے اور اس کے رسیلے ہونٹوں پر اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دے۔ لیکن اسی وقت ایک جھٹکے کے ساتھ ساز خاموش ہو گئے۔ رقص کرتے ہوئے قدم رک گئے۔ اور رما اور ساگر اپنی میز پر واپس آ گئے۔

بیرا آرڈر کے مطابق اُن کی میز پر سینڈوچ اور پیسٹریوں کی ڈشیں سجا کر چلا گیا۔

سینڈوچ کا آخری ٹکڑا چباتے وقت جیسے ہی ساگر کی نگاہیں مہندر پر پڑیں اُس نے اس طرح منھ بنایا جیسے کوئی تلخ سی چیز زبان پر رکھ لی ہو۔

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ لوگوں کی مشغولیت میں مخل ہو رہا ہوں۔"

اُس کا دوست مہندر اس کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ رما منھ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارے لئے کیا منگوایا جائے؟ بیئر یا وہسکی!؟"

مہندر کی بے وقت کی آمد سے چڑ کر ساگر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو بے پئے ہی نشہ سا چھا رہا ہے!"

مہندر نے رما کی جھیل جیسی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

رما کے خلاف مہندر کا یہ غیر مہذب جملہ سن کر ساگر کا خون کھول اٹھا۔ وہ سخت لہجے میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رما کرسی سے اٹھتی ہوئی بولی —

"ساگر صاحب! میں اپنی ایک سہیلی سے مل کر آتی ہوں۔"

یہ کہتی ہوئی رما ایک میز کی طرف چلی گئی جس پر ایک الٹرا ماڈرن سی لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔

"ساگر! تم رما کا خیال چھوڑ دو۔ وہ تم سے فلرٹ کر رہی ہے!"

مہندر نے اسی کی طرف دیکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"مہندر!" ساگر بھڑک اٹھا —

"تم ایک شریف لڑکی پر الزام لگا رہے ہو۔"

"شریف لڑکی!" مہندر نے طنز آمیز لہجے میں کہا —

"تم جانتے ہو ابھی تم سے ملنے سے پہلے وہ کہاں تھی!؟"

"کہاں تھی!؟" ساگر نے مہندر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"ڈی لکس ہوٹل کے ایک فیملی کیبن میں ایک نوجوان افسر کے ساتھ دادِ عیش دے رہی تھی!"

مہندر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مہندر!"

ساگر چیخ اٹھا اور ساتھ ہی مہندر کے گال پر ایک طمانچہ مارتے ہوئے بولا —

"ایک شریف لڑکی کی عزت پر کیچڑ اچھالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

مہندر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ساگر برسوں کی دوستی کو اس طرح خاک میں ملا دے گا۔

"ساگر! میں تم سے ابھی وقت اس طمانچے کا بدلہ لے سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے اب بھی تم سے ہمدردی ہے۔"

مہندر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی رما نے واپس آکر اپنے نرم و گداز ہاتھ ساگر کے شانوں پر رکھ دیئے اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا ہوا تھا ڈیر! تم نے تو اس لفنگے کی خوب خبر لی!"

"اوہ، رما! میں بہت پریشان ہوں۔ آؤ کسی پرسکون جگہ چل کر بیٹھیں۔"

ساگر نے رما کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر کلب کے پارک میں چلے آئے۔

پارک کا وہ گوشہ جہاں وہ لوگ بیٹھے تھے گلاب کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رما مدہوش ہو کر ساگر کے پہلو میں لیٹ گئی۔ اور ساگر اس کی ریشمی زلفوں سے کھیلتا ہوا گنگنا اٹھا۔ وہ جب تک گاتا رہا رما اس کی آواز کے سحر میں کھوئی رہی۔ اور جیسے ہی ساگر نے گانا ختم کیا رما اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کی قمیص کے کالروں سے کھیلتی ہوئی بولی ــــــ

"ساگر! تم آواز کے جادوگر ہو!"

ساگر نے منہ سے کچھ نہ کہا لیکن اسے کھینچ کر اپنے بیتاب سینے سے لگا لیا اور اپنے پیاسے اور تپتے ہوئے ہونٹ اس کے ترستے ہوئے سرخ ہونٹوں پر رکھ دیے۔

دور گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے۔ اور وہ گھبرا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

آہستہ آہستہ ان کی ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں۔ رما ساگر کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئی کہ اس کے بغیر ایک پل بھی اسے چین نہ ملتا تھا۔ شام کو دفتر سے واپس آنے کے بعد جب وہ اپنے ویران کمرے

یں داخل ہوتا تو تنہائیوں کے ناگ اسے ڈسنے لگتے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد رما کو دلہن بنا کر اپنے ویران کمرے میں لے آئے تاکہ کمرے کی ویرانی اور اداسی دور ہو جائے۔ اور ہر طرف اس کے خوبصورت وجود کی خوشبو پھیل جائے۔ لیکن اس نے جب بھی شادی کے متعلق رما سے کچھ کہنا چاہا وہ خوبصورتی سے ٹال گئی۔

ایک بار ساگر پروگرام سے پہلے ہی اپنا بزنس ختم کر کے واپس آگیا۔ رما سے ملنے کے لئے جب وہ کلب پہنچا اس وقت آرکسٹرا کی مست کر دینے والی دھنوں پر مخمور جوانیاں تھرک رہی تھیں۔ وہ ایک خالی میز کے سامنے بیٹھ گیا اور رقص کرتے ہوئے حسین جوڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ذہن میں سلگتے ہوئے انگارے بھر دیئے ہوں۔ اس نے رما کی طرف دیکھا جو بہت بے تکلفی سے ایک خوبرو نوجوان کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھی۔ وہ سرخ ساڑی اور سرخ بلاؤز میں ملبوس اپنے حسن و شباب کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ رما کی نگاہیں جب ساگر سے ملیں تو خلاف توقع اسے اس وقت وہاں دیکھ کر وہ پل بھر کے لئے بوکھلا گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا لیا اور اس نوجوان کے ساتھ رقص کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

ساگر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کلب سے باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ اور اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پیار بھرے لمحے بے وفائی کی آگ میں سلگ رہے تھے اور اس کی جلتی ہوئی نگاہوں کے سامنے اعتماد کی راکھ اڑ رہی تھی۔

دوسرے دن آفس سے واپس آنے کے بعد ساگر سیدھا رما کے یہاں پہنچا۔ وہ بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ اس کی ریشمی زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں کیف سرور کی مستی گھلی ہوئی تھی۔ ساگر پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور حیرت زدہ لہجے میں بولی ــــــ

"ہیلو ساگر! کہو کب آئے؟"

"رما! انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ آج میں شادی کے متعلق تمہارا آخری جواب سننے آیا ہوں۔"

ساگر نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"شادی! شادی! شادی ——!"

"ساگر! تم نے شادی بیاہ کو کیا بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے؟ تم مجنوں اور فرہاد کے ذہن سے سوچتے ہو۔ لیکن میں اس طرح نہیں سوچتی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب محبت کے انداز اور طور طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ مجھے تمہاری آواز پسند ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں تم سے شادی بھی کر لوں!؟ تم ہی سوچو کہ شادی کے بعد تم مجھے کیا دے سکتے ہو؟ تم جو تنخواہ پاتے ہو اُس سے زیادہ تو میں ہر ماہ کلب میں خرچ کر ڈالتی ہوں —— تم جیسے تنگ نظر اور کم حیثیت آدمی سے شادی کے متعلق تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ——!"

رما نے حقارت آمیز لہجے میں کہا —— اور قسمت کے اس مذاق پر ساگر کا پیار بھرا دل سسک اٹھا! اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے رما نے اُسے بلندی سے اٹھا کر پستی کے غار میں دھکیل دیا ہو۔ رما کی بے رخی نے اُسے اتنا بددل کر دیا کہ پھر کبھی اس کی مچلتی ہوئی پُرسوز آواز کسی محفل میں نہیں سُنی گئی۔

ماہنامہ روشنی، میرٹھ

جنوری ۱۹۷۵ء

ڈوبتے سورج کا کرب

سخاوت ایک جوٹ مل میں ڈبل تانت چلاتا تھا۔ پینتیس لگ بھگ ایک صحتمند اور خوبرو مزدور جس کے کندھوں پر اس کی بیوی اور تین بچوں کی گھریلو ذمہ داریاں تھیں۔ اس کا تعلق ایک شریف اور عزت دار گھرانے سے تھا اور وہ اپنی بیوی کا وفادار شوہر تھا اور اپنے بچوں کا ایک اچھا اور پیار کرنے والا باپ تھا۔ لیکن جب سے جانکی اس علاقے میں آئی تھی وہ اس کی کہانی سے متاثر ہو کر اس کے خیالوں میں کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے جانکی کے کمرے کے سامنے سے گزرنا اور اسے دیکھنا روزانہ کا معمول بنا لیا۔ شروع شروع میں تو وہ جانکی کے سامنے سے گزرتا ہوا اس پر حسرت بھری نگاہیں ڈال کر آگے بڑھ جاتا۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ جانکی کے سامنے پہونچکر رک جاتا اور چند لمحوں تک حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد آگے بڑھتا۔

جانکی بائی سخت الجھن میں تھی۔ اپنی مختصری طوائفانہ زندگی میں اس نے آج تک ایسا کوئی آدمی نہ دیکھا تھا جو اس کے دروازے تک آکر اس طرح واپس چلا گیا ہو۔ ایک دن جب سخاوت چند لمحوں تک اس کے سامنے رک کر اس کی طرف دیکھنے کے بعد آگے بڑھنے لگا تو اس نے اسے آواز دی۔

"سنیئے!"

"آپنے مجھے پکارا!؟"

سخاوت نے پلٹ کر حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! میں ہی آپ کو آواز دی تھی۔"

جانکی نے ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیے" اُس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایسے نہیں۔ پہلے آپ اندر تشریف لائیے۔"

جانکی بائی کی اس دعوت پر سخاوت کا دل دھڑک اٹھا اور اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جانکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ کمرے کے اندر لے گئی۔ گھبراہٹ اور شرم سے سخاوت کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ آخر جانکی ہی نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا ــــ

"سرکار! یہ جانکی بائی کا کمرہ ہے، کوئی مندر یا مسجد نہیں! اور میں ایک طوائف ہوں، کوئی سیتا یا حوا نہیں جو آپ اس طرح احتراماً ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ بیٹھ جائیے اور کام کی باتیں کیجیے۔ یہ میرے دھندے کا وقت ہے۔ اگر آپ کو شرم آرہی ہے تو میں خود ہی ...."

"جانکی! تم نے مجھے غلط سمجھا۔ میں یہاں اسلئے نہیں آیا کہ ایک درندے کی طرح تمہارے خوبصورت جسم کو نوچوں کھسوٹوں اور اپنی جنسی پیاس بجھاؤں۔"

سخاوت نے جانکی کے سامنے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ ایک طوائف کی چوکھٹ پر کیا لینے آئے ہیں!؟"

جانکی نے سخاوت کی طرف دیکھتے ہوئے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"جانکی! میں نے جب تمہاری دکھ بھری کہانی سنی ہے مجھے تم سے بے پناہ ہمدردی ہو گئی ہے۔"

سخاوت نے جانکی کی بڑی بڑی کنول جیسی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میری کہانی ــــ!؟" جانکی چونک اٹھی۔

"ہاں جانکی! میں جانتا ہوں کہ تمہارا تعلق ایک شریف خاندان سے ہے۔ بلاسپور میں تمہارا اپنا گھر ہے جہاں تمہارے بوڑھے والدین اب بھی تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں اداکاری کا شوق ہے اور یہی شوق تمہیں لے ڈوبا۔ دو سال قبل ایک بار کالج کا ڈرامہ ختم ہونے کے بعد

جب تم میک اپ روم کی طرف واپس جارہی تھیں تو کلکتہ کے ایک دلال نے ایک نقلی ہدایت کار بن کر تمہاری اداکاری کی اتنی تعریف کی کہ تم بہک گئیں۔ اور ایک دن ماں باپ، بھائی بہن سبھوں سے منہ موڑ کر تم اس کے ساتھ کلکتہ آگئیں۔ ایک فلم اسٹار بننے کیلئے! لیکن یہاں پہنچ کر اس نے تمہیں دھوکا دیا اور زبردستی تم سے دھندا کرایا۔ فلم اسٹار بننے کے لئے تم نے یہ بھی گوارہ کرلیا۔ لیکن ایک دن اس نے تمہیں دوسرے دلال کے ہاتھوں بیچ ڈالا اور تمہیں چھوڑ کر چپکے سے فرار ہوگیا۔ تم نے اس دلدل سے نکلنا چاہا۔ لیکن جب تمہیں معلوم ہوا کہ نتھو دلال نے ہزاروں روپے خرچ کرکے تمہیں حاصل کیا ہے تو تمہیں اس پر ترس آگیا اور اس کے روپے وصول کرنے کے لئے تم اس کے لئے دھندا کرنے لگیں۔ لیکن نتھو تمہاری شرافت سے اتنا متاثر ہوا کہ ایک دن اس نے تمہیں آزاد کردیا۔ تم چاہتیں تو اپنے والدین کے پاس بلاسپور واپس جاسکتی تھیں۔ لیکن تم نے اپنے اس گناہ آلود جسم کے ساتھ ان کے پاس جانا مناسب سمجھا اور پھر تم دن بدن گناہ کی اس دلدل میں پھنستی ہی چلی گئیں ــــ"

"بس بس۔ بھگوان کے لئے چپ ہو جاؤ۔ میرے اندر اب اور کچھ سننے کی تاب نہیں۔"

جانکی سخاوت کی زبانی اپنی دکھ بھری داستان سن کر تڑپ اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ سخاوت نے اُسے چپ نہیں کرایا۔ اس نے اُسے رونے دیا تاکہ دل کا سارا دکھ آنسو بن کر آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلے۔ وہ اُسے روتی ہوئی چھوڑ کر چپکے سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دن جب سخاوت بی۔ ننگٹ کرکے واپسی میں جانکی کے پاس پہنچا تو اسے دیکھتے ہی اس کا غمگین چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ جھٹ سے اسٹول سے اٹھی اور اسے لے کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک یہی ہوتا رہا۔

سخاوت جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہوتا جانکی جھٹ سے دروازے کی چٹخنی گرادیتی۔ پھر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے۔ ایک انوکھے جذبے کے تحت دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ سخاوت چلتے وقت جانکی کو روپے دینے لگتا تو وہ انکار کردیتی

اور کہتی ــــ

" روپے کس بات کے ــ!؟"

" یہ تمہارے بزنس کا وقت ہے ۔ میں نے تمہارا اتنا وقت برباد کیا ۔ اسی کی فیس سمجھو ۔"

سخاوت مسکراتے ہوئے کہتا ۔

" نہیں سخاوت! یہ روپے رکھ لو ۔ تمہارے بال بچوں کے کام آئیں گے ۔"

جانکی اس کے روپے لوٹاتی ہوئی کہتی ۔ اس طرح اس نے کبھی اس کا پیسہ بھی قبول نہ کیا ۔ ماں باپ سے بچھڑ کر وہ سخاوت کو اپنا سمجھنے لگی تھی جو اس کے دکھ درد سے واقف تھا اور اس سے ہمدردی رکھتا تھا ۔ اگر وہ کسی دن نہ آتا تو وہ اداس ہو جاتی اور کوئی جان پہچان کا آدمی مل جاتا تو اسے بلانے بھیج دیتی ۔

ایک دن سخاوت جانکی کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی ۔ جانکی نے جھنجھلاتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سامنے کرتا دھوتی پہنے بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا ۔ جانکی پر نظر پڑتے ہی وہ بول اٹھا ۔

" ایک دم کشمیری ماڈل ــــ چلے گا!"

اس کے منہ سے شراب کا تیز بھبکا نکل کر جانکی کی سانسوں میں داخل ہو گیا ۔ اس نے تیزی سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ــــ

" میں اس وقت خالی نہیں!"

اور وہ جانکی کو ایک گندی سی گالی دے کر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ۔

دوسرے دن جب جانکی اور سخاوت کمرے کے اندر بیٹھے ایک دوسرے کو ہمدردی اور عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی ۔ جانکی نے بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھول دیا ۔

سامنے وہی شخص کھڑا شراب کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے اندر داخل ہونا چاہا۔ لیکن جانکی نے اچانک اسے باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

" دیکھتے نہیں اندر گاہک موجود ہے!؟"

" جانکی بائی! تم بازارِ حُسن میں بیٹھ کر مجھے اپنے پاس آنے سے نہیں روک سکتیں۔ میں کل پھر آؤں گا اور دیکھوں گا کہ تم مجھے کیسے روکتی ہو!"

اس نے خوفناک لہجے میں کہا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جانکی آکر سخاوت کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی ریشمی زلفیں کھُل کر اُس کے شانوں پر بکھر گئیں اور اُس کا حسین چہرہ غصّہ کی آنچ سے تمتما اٹھا۔

" تمہیں میری وجہ سے پریشانی ہوتی ہے جانکی۔ میں کل سے تمہارے پاس نہ آؤں گا۔" سخاوت نے اداس لہجے میں کہا۔

" تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو سخاوت! یہاں تو یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو تمہاری بزدلی ہوگی کہ تم اس غنڈے کے ڈر سے یہاں آنا بند کر دو۔"

جانکی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

" جانکی! تم سمجھتیں کیوں نہیں؟ اگر تم اسی طرح اپنے گاہکوں کو دھتکارتی رہیں تو گزارہ کیسے ہوگا؟"

سخاوت نے ہمدرد لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

" تم اس کی پروانہ کرو سخاوت! جس نے پیدا کیا ہے وہی کھانے کو بھی دے گا۔"

جانکی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ سخاوت لاجواب ہو کر اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن سخاوت کے اندر داخل ہونے کے بعد جیسے ہی جانکی نے کمرے کا دروازہ بند کیا کوئی زور زور سے دستک دینے لگا۔

"میں خالی نہیں ہوں۔ کہیں اور جاؤ۔"

جانکی نے اندر ہی سے تیز لہجے میں کہا۔

"جانکی بائی! دروازہ کھولو۔ کیوں مجھے اپنا دشمن بنا رہی ہو؟"

آنے والے نے اسی طرح دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔

"کہہ دیا ناکہ میں خالی نہیں پھر کیوں مجھے تنگ کرتے ہو؟"

جانکی نے بیزار لہجے میں کہا۔

"جانکی! میں تجھے صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تو نے دروازہ نہ کھولا تو میں اسے توڑ کر اندر آجاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی آنے والا دروازے کو زور زور سے دھکا دینے لگا۔ اور جانکی نے بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے وہی شخص کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ شراب کے نشے میں چور تھا۔ دروازے کھلتے ہی وہ جانکی کو دھکیلتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سخاوت نے ایک زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ اس اچانک حملے سے وہ غنڈہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوسرے لمحہ اس نے اپنی جیب سے ایک لمبا سا چاقو نکال لیا اور اسے کھول کر لہراتا ہوا سخاوت کی طرف بڑھا۔ سخاوت اس غنڈے کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو دیکھ کر گھبرا گیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے اس غنڈے نے بڑی پھرتی سے وہ چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اس نے پے درپے کئی وار کر کے سخاوت کے سینے کو چھلنی کر ڈالا اور چاقو لہراتا ہوا تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

جانکی ساری رات بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتی رہی اور ذہنی کرب میں مبتلا رہی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف سے سخاوت کی حسرت بھری نگاہیں اسے گھور رہی ہوں!

دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے جانکی نے نہا دھو کر سفید ساڑی باندھ لی اور ایک تھال میں ناریل اور کچھ بتاشے رکھ کر من کی شانتی ڈھونڈنے مندر چلی گئی۔ دوپہر کے بعد وہ اپنی جو کھٹ

بے شمار کڑی سخاوت کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان اس کا خوبصورت سراپا دیکھ کر ٹھٹک گیا اور

ہوسناک نگاہوں سے اس کی جانب گھورنے لگا۔

"آگے جاؤ بابو! اس زندہ لاش سے کیا لینے کے لئے یہاں رک گئے!؟"

جانکی نے سرد لہجے میں کہا اور وہ نوجوان بددل ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح جانکی ہر ایک کو ٹالتی رہی۔ وہ گناہوں

کی اس دلدل سے نکل کر کوئی ایسا کام کرنا چاہتی تھی جس سے عزت کے ساتھ اسے دو وقت کی روٹی میسر ہو۔

لیکن کئی دنوں کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سخاوت کے مرجانے سے اس کی بیوی اور بچے فاقہ کر رہے ہیں

تو اس کے فیصلے کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ "کیا اپنا پرایا کوئی ان لوگوں کے کام نہ آیا!؟ کیا کسی نے بیوہ اور

یتیموں کو سہارا نہ دیا؟" جانکی نے بہت دکھ کے ساتھ سوچا۔ دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی طرح اس کے

ذہن میں کوند گیا اور اس کے سرد جسم میں ایک بار پھر زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک رکشہ میں بیٹھ کر لوگوں سے پوچھتی ہوئی سخاوت کے گھر تک پہنچ گئی۔

اس نے آہستے سے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد سخاوت کی بیوہ نے دروازہ کھول دیا۔ شوہر کے

غم میں وہ نڈھال سی ہو رہی تھی اور صدمے اور فاقے سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

اس کے بچوں کا بھی بھوک سے برا حال تھا۔ تینوں بچے آکر اس سے لپٹ گئے۔ اور کھانے کے لئے مانگنے لگے۔ اس نے

بچوں کو جھڑک دیا اور جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں جانکی ہوں۔ میں ——"

"اوہ جانکی بائی! اے ناگن تو تو پہلے ہی میرے شوہر کو ڈس چکی ہے۔ اب یہاں کیا لینے آئی ہے؟"

سخاوت کی بیوہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

جانکی کے کچھ کہنے سے پہلے وہاں لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ ان میں کچھ لوگ جو جانکی کو پہچانتے تھے

اس کے گرد اکٹھے ہو کر چلانے لگے۔

" مارو سالی کو! یہ خونی ہے۔ اسی نے سخاوت کی جان لی ہے۔"

لیکن جانکی نے بپھرے ہوئے ہجوم کی کوئی پروا نہ کی اور سخاوت کی بیوہ سے کہا۔

" بہن جی! آپکے پتی کو ابھی بہلانے مرنا تھا۔ میں بالکل نردوش ہوں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے پتی کی جان میری ہی وجہ سے گئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ساری زندگی آپ کی اور آپکے بچوں کی خدمت کرتی رہوں گی۔ رکشہ پر کھانے پینے کا سامان رکھا ہے۔ اسے اتروالیں۔ آج سے آپ لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمّہ دار میں ہوں! "

سخاوت کی بیوہ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے لوگوں کے خود غرض اور ظالم چہروں کی طرف زخمی نگاہوں سے دیکھا اور جانکی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی جیسے وہ آج ہی بیوہ ہوئی ہو!!

مرک ، آسنول

جولائی ۱۹۷۵ء

ڈوبتے سورج کا کرب

پگھلتا ہوا وجود

"ہیلو! تھری دن تھری فور ـــــ!"

ٹیلیفون کا رسیور سراج کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔

"ہیلو! ڈاکٹر مکھرجی اسپیکنگ!"

دوسری طرف سے ڈاکٹر مکھرجی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میری وائف اچانک پیٹ میں شدید درد ہونے کی وجہ سے بہت بے چین ہیں۔ آپ فوراً آجائیے پلیز ــ!"

سراج نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور ٹیلیفون کا رسیور کریڈل پر رکھ کر بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ ہی منٹ کے بعد کار کے ہارن کی آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا باہر گیا اور ڈاکٹر کو لے کر پروین کے کمرے میں داخل ہوا۔

"ان کی یہ حالت کب سے ہے؟"

ڈاکٹر نے ٹیبل پر اپنا ہینڈ بیگ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! تھوڑی ہی دیر پہلے ہم چائے پی رہے تھے۔ چائے پیتے ہوئے اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے پیٹ میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ درد سے تڑپنے لگیں اور ......"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے درد سے کراہتی ہوئی پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہینڈ بیگ سے اسٹیتھسکوپ نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

سراج نے پروین کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے دُھندلکا سا چھانے لگا تھا۔ پچھلی باتیں اُس کے ذہن کے پردے پر کسی رنگین فلم کی طرح گھومنے لگیں۔ وہ دیکھتا ہے ——

ڈرائنگ روم میں اُس کے اور اُس کے والد کے علاوہ ایک اجنبی بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے کانوں میں اجنبی کی آواز گونجتی ہے ——

'حلیم صاحب بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ لاکھوں کا کاروبار ہے۔ میں اُن کا منیجر ہوں۔ انہیں اپنی گریجویٹ لڑکی کے لئے ایک اچھے گھرانے کے تعلیم یافتہ لڑکے کی تلاش ہے۔ حلیم صاحب کو ان کے بزنس پارٹنر نے بتایا ہے کہ آپ کو بھی اپنے لڑکے کے لئے ایک تعلیم یافتہ' خوبصورت اور دولتمند گھرانے کی لڑکی کی تلاش ہے۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں مجھے آپ کا لڑکا ہر لحاظ سے پسند ہے۔ آپ لڑکے کی فرمائشیں نوٹ کرا دیں۔ اور ایک حالیہ تصویر بھی دے دیں۔ آپ کے لڑکے کی قسمت اچھی ہے۔ قیمتی جہیز کے علاوہ بیس ہزار روپے نقد ملیں گے۔'

یہ کہنے کے بعد اجنبی نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک دیدہ زیب ڈائری نکالی ہے اور اُس کے اوراق الٹنے لگا ہے۔ اس ڈائری میں مختلف نام اور پتے درج ہیں۔ اجنبی نے دوسری جیب سے پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر نکال کر اُس کے والد کے سامنے میز پر رکھ دی ہے۔ اُس کے والد نے تصویر دیکھنے کے بعد اُس کی

طرف بڑھا دی ہے۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کا دل دھڑک اٹھا ہے۔ یہ ایک بے حد خوبصورت لڑکی کی تصویر ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اجنبی اُس کے دل کا حال خاموش نگاہوں سے پڑھ لیتا ہے اور کہتا ہے ـــــ

'اس سلسلے میں حلیم صاحب کی ایک شرط ہے کہ شادی ایک مہینے کے اندر ہی ہو جانی چاہئے۔'

'ایک مہینے کے اندر ـــ !! لیکن میں تو ایک سال سے پہلے اپنے لڑکے کی شادی نہیں کر سکتا۔'

'تب تو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ حلیم صاحب کی خوبصورت اور گریجویٹ لڑکی کیلئے لڑکوں کی کمی نہیں۔'

'مینجر صاحب! شادی تو ایک مہینے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں اتنی جلدی شادی کا انتظام کس طرح کر سکوں گا؟'

'آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ لیجئے دس ہزار روپے۔ اس رقم سے شادی کا انتظام کیجئے۔ نکاح کے بعد باقی دس ہزار روپے بھی آپ کو مل جائیں گے۔'

سراج کو اپنے کانوں میں یہ باتیں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ایک مہینے کے اندر ہی پروین اس کی دلہن بن کر آجاتی ہے۔ اس پیکرِ حسن و شباب کو پا کر وہ رنگین خوابوں میں کھو جاتا ہے۔ پروین کی ریشمیں زلفوں کی چھاؤں میں اُسے زندگی جھومتی اور گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اُس کے حسن و رعنائی میں کھو کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

"مسٹر سراج!"

"..........."

"مسٹر سراج! آپ کیا سوچ رہے ہیں!؟"

دوسری بار ڈاکٹر کے پکارنے پر وہ کرسی پر بیٹھا چونک اٹھا۔ یادوں کا خوابناک سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ کرسی سے اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس آگیا۔

"مسٹر سراج! میں نے آپ کی مسز کو ایک انجکشن لگا دیا ہے۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی مسز امید سے ہیں"۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر!" سراج حیرت سے چیخ اٹھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟! ابھی پچھلے ہی مہینے تو ہماری ———!"

اچانک الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ دل کا آبگینہ چور چور ہو گیا اور رنگین خواب حقیقت کی آتشیں چٹان سے ٹکرا کر بکھر گئے۔

اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بیس ہزار روپے کے نوٹوں میں آگ لگ گئی ہو اور جلتے ہوئے نوٹوں کے درمیان گھرا ہوا اس کا وجود موم کی طرح پگھل رہا ہو!!

"بیسویں صدی" دہلی
مارچ ۱۹۷۶ء

ڈوبتے سورج کا کرب

اندھیرا

ندیم کا نام ہی سن کر اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ ندیم انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری لے کر امریکہ سے واپس آ رہا ہے تو اُس کی کامیابی پر وہ مسکرا اٹھی اور اُس کے دل میں خوشی کی پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

ندیم اس کی پھوپھی کا لڑکا تھا۔ ان کے گھر بالکل آمنے سامنے تھے۔ اس لئے دونوں کا بچپن ایک ساتھ ہنستے کھیلتے اور روٹھتے مناتے گزرا تھا۔ مدرسہ اور اسکول میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دونوں نے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ وہ گرلز کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے والدین نے اُسے ندیم کے ساتھ داخلہ دلایا کیونکہ انہیں اُس سے بہتر کوئی دوسرا محافظ نہ مل سکتا تھا۔ اور ندیم نے واقعی یہ سچ کر دکھایا۔ وہ رکشے سے کالج جایا کرتی تھی۔ ندیم کی سائیکل کبھی رکشے سے آگے رہتی کبھی پیچھے۔ اُس نے برقع کا روگ نہ پالا تھا۔ اس کے والدین نے اُسے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ اُس کے لئے تیار نہ ہوئی اور کھلے رکشہ میں بیٹھ کر کالج جایا کرتی۔ راستے میں وجیہہ اور بدصورت نوجوان، ادھیڑ اور بوڑھے مرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اُس کی طرف دیکھا کرتے۔ اور ہوسناک نگاہوں کے اُن زہریلے تیروں سے اُس کا نازک جسم چھلنی ہو جایا کرتا۔ اُسے مردوں کی ہوسناک اور بھوکی نگاہوں سے خوف محسوس ہوتا۔ لیکن ندیم کا وجود ہمیشہ اس خوف پر غالب رہتا تھا۔

ایک دن ندیم راستے میں ایک دکان سے سگریٹ لینے کے لیے رک گیا۔ رکشہ کچھ آگے نکل گیا۔ اچانک سامنے سے آتے ہوئے ایک لمبے تڑنگے نوجوان نے جس کے سر کے بال بڑھے ہوئے اور شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے، اس کا رکشہ روک لیا اور اُسے اس طرح گھورنے لگا کہ وہ ڈر گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بدتمیزی کرتا ندیم اپنی سائیکل لیے ہوئے آ پہنچا اور اس نے اُس نوجوان کی کن پٹی پر ایسا گھونسہ جمایا کہ وہ تلملا کر گر پڑا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اٹھا اور ڈگمگاتا ہوا رکشے کے سامنے سے آگے بڑھ گیا۔ اُس دن اُس نے ایک نئے زاویے سے ندیم کو دیکھا تو اس کا کتابی چہرہ، صاف رنگت اور کسرتی بدن دیکھ کر اُسے اُس پر اپنے خوابوں کے شہزادے کا گمان ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے اس خیال پر شرما گئی اور اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر اپنے خیالوں میں کھو گئی۔

اُس دن کالج کی 'بزم ادب' کی جانب سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شہر کے نمائندہ شاعروں کے علاوہ کالج کی طالبات اور طلبہ حصہ لے رہے تھے۔ صدارت کے لئے ملک کے ایک مشہور و معروف شاعر کو بلایا گیا تھا۔ پورا ہال برقی قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ "خوش آمدید" کے بلب جگمگا رہے تھے۔ اراکین بزم ادب اور دوسرے والنٹیرس گرمجوشی سے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ مدعو شعراء اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ اچانک مائک پر بزم ادب کے سکریٹری کی آواز گونجی ــــــ

"صدر محترم! معزز حضرات اور ساتھیو! میں آپ لوگوں کا بے حد ممنون ہوں کہ آپنے اپنی مصروفیتوں کے باوجود بزم ادب کے اس سالانہ مشاعرے میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنایا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مشاعرہ رات کے دس بجے تک ختم کر دیا جائے تاکہ دور جانے والے طلبہ و طالبات کو واپسی میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ مشاعرے کے پہلے دور میں کالج کی طالبات اور طلبہ حصہ لیں گے۔ اور دوسرے دور میں وہ شعرائے کرام حصہ لیں گے جنہیں خاص طور سے اس مشاعرے کیلئے دعوت سخن دی گئی ہے۔ اب میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ اسلئے مشاعرے کا

آغاز کرتے ہوئے محترم پروفیسر اعظمی کو زحمت دے رہا ہوں کہ وہ مائک پر تشریف لائیں اور نظامت کے فرائض انجام دیں"۔

اس اعلان کے بعد پروفیسر اعظمی نے اٹھ کر مائک سنبھال لیا۔

وہ پہلی بار انہیں اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اُن کی ذہین اور چمکتی ہوئی آنکھیں اور دلکش مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ کھو سی گئی۔ اور جب دعوت سخن دیتے ہوئے انہوں نے اس کا نام پکارا تو وہ گھبرا سی گئی۔

بہت مشکل سے اُس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پایا اور اپنی خوبصورت سی ڈائری کھول کر مطلع سنایا۔ اُس نے سوچا تھا طلبہ کی ہوٹنگ سے اسے مائک چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ لیکن مطلع ہی پر اسے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعرائے کرام اور طلبہ کی جانب سے اس طرح داد ملی کہ اُس نے خود اعتمادی کے ساتھ جم کر پوری غزل سنائی۔ جب غزل ختم ہوئی تو پروفیسر اعظمی نے اس کے کلام، اس کی دلکش آواز اور اس کے دلکش انداز تکلم کی اتنی تعریف کی کہ وہ جھینپ کر رہ گئی۔ رات کے آٹھ بجے تک طلبہ اور طالبات اپنا کلام سناتے رہے۔ آٹھ بجے کے بعد مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تقدیم و تاخیر کے مسئلے کا حل پروفیسر اعظمی نے یہ نکالا کہ انہوں نے دوسرے دور کا آغاز اپنی ہی غزل سے کیا۔ غزل معیاری تھی۔ ہر شعر پر خوب داد ملی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ پروفیسر اعظمی کی مترنم اور پرسوز آواز کے سحر میں کھو سی گئی۔ اُس کی محویت اس وقت ٹوٹی جب پروفیسر اعظمی اپنی پوری غزل سنانے کے بعد کسی دوسرے شاعر کو دعوت سخن دے رہے تھے۔ مشاعرہ پورے شباب پر تھا۔ پروفیسر اعظمی کبھی کبھی اپنے دلچسپ ادبی لطیفوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ اور کچھ دیر کے لئے محفل کا رنگ بدل جاتا۔ رات کے دس بجے صدر مشاعرہ کی غزل اور صدارتی تقریر کے بعد مشاعرے کی کارروائی ختم ہوتے ہی کچھ لڑکوں اور لڑکیوں نے پروفیسر اعظمی کو گھیر لیا اور ان کے آٹو گراف لینے لگے۔

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اور جب پروفیسر اعظمی تنہا رہ گئے تو اس نے بھی اُن کی طرف اپنی خوبصورت سی ڈائری بڑھا دی۔

پروفیسر اعظمی نے اس کی ڈائری پر لکھا۔

آپ کی بات ، بات پھول کی

آپ کا ساتھ ، ساتھ پھول کا

اور انہوں نے اپنا آٹوگراف دیتے ہوئے کہا ــــ

" یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آپ زیادہ حسین ہیں یا آپ کی آواز ! "

اپنے متعلق یہ الفاظ سن کر اس نے نگاہیں اٹھا کر کچھ اس طرح پروفیسر اعظمی کی طرف دیکھا کہ انہیں اپنے دل کی دنیا ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی تحریر پڑھ کر حیا کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھک گئیں۔

اور وہ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ندیم کے ساتھ فنکشن ہال سے باہر نکل آئی۔

واپسی میں کوئی سواری نہ ملی اور وہ لوگ پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد یکایک ندیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ

" نسرین ! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم لوگ چند لمحوں کے لئے یہاں ٹھہر جائیں۔ "

اور ندیم کی اس درخواست پر وہ اچانک خوفزدہ سی ہو گئی۔ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے ندیم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا ــ

" نسرین ! میں نے آج تک تم سے یہ راز چھپائے رکھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ لیکن آج پروفیسر اعظمی کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر میں ڈر گیا کہ کہیں وہ تمہیں مجھ سے چھین نہ لیں۔ بولو نسرین کیا زندگی کے سفر میں تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گی ! ؟ "

بچپن کا ساتھی اپنی خالی جھولی پھیلائے اس سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا جس کے دربار میں عشق فریادی بن کر کھڑا تھا۔ وہ بے اختیار ندیم کے شانے سے لگ گئی۔ ندیم نے فرطِ محبت سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اس واقعے کے چند دنوں کے بعد ندیم انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کیلئے امریکہ چلا گیا۔

اسے ہر ماہ ندیم کا خط ملتا جس میں اس کی جدائی میں دل نہ لگنے کا اظہار ہوتا۔ ان دنوں اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ ان خطوں کو بار بار پڑھتی اور تصوّر میں ندیم سے باتیں کیا کرتی۔ وہ انجانے میں کبھی کبھی اس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کر کے ایک عجیب سی لذّت سے آشنا ہو جاتی۔

ایک دن اچانک نیشنل پارک میں پروفیسر اعظمی سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ دورانِ گفتگو پروفیسر اعظمی نے دبے لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اسے جیون ساتھی بنانے کی درخواست بھی کر دی۔ اور ان کی اس درخواست پر وہ شدید الجھن میں پڑ گئی۔ ایک طرف پروفیسر اعظمی کی شخصیت اور ان کی محبت اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دوسری طرف ندیم سے کیا ہوا وعدہ اس کے پیروں میں زنجیر ڈال رہا تھا۔

"آپ نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا؟"

پروفیسر اعظمی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر صاحب! مجھے آپ کی شاعری، آپ کی پرسوز آواز اور آپ کا ترنّم پسند ہے تو اس کے معنی یہ تو نہیں کہ میں آپ کو اپنا جیون ساتھی بنا لوں!؟ مجھے تو ندیم کا انتظار ہے جو انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے۔"

پروفیسر اعظمی کے پیار بھرے دل کو ٹھکرا کر وہ ندیم کے تصوّر میں کھو گئی۔

اور آج ندیم امریکہ سے انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری لے کر واپس آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی صفائی کر کے ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ غسل کر کے آسمانی رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ سے میچ کرتا ہوا بلاؤز پہنا اور جوڑے میں ندیم کا من پسند گلاب کا پھول سجا کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ کئی برسوں کی جدائی نے اس کے شوقِ دیدار کو بھڑکا دیا تھا۔ جیسے جیسے ملن کی گھڑیاں قریب آ رہی تھیں، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

یکایک کار کے ہارن کی آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی اور پردہ

کھسکا کر باہر کی طرف دیکھنے لگی ـــ اُس کا ندیم ایک امریکن خاتون کو کار سے اُتار رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھی۔ اُسی وقت کسی کے پوچھنے پر ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ

"جی ہاں، یہ میری امریکن وائف ہیں!"

یہ سُنتے ہی اُس کے دل کی دھڑکنیں رُکنے سی لگیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور وہ غش کھا کر گر پڑی! ـــ جب ہوش میں آئی تو اُس کے سامنے حدِ نظر تک اندھیرا تھا!

بیسویں صدی، دہلی

ستمبر ۱۹۷۶ء

ڈوبتے
سورج کا کرب

لرزتے آنسو

ٹرن ..... ٹرن ..... ٹرن!

پروفیسر مختار کالج سے آ کر کپڑے بدل ہی رہے تھے کہ کال بیل کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بیگم کچن میں مصروف تھیں۔ بے وقت کی مداخلت سے کہیں بیگم کا پارہ نہ چڑھ جائے۔ یہ سوچ کر پروفیسر مختار نے خود ہی بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک کر دروازے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ سامنے نوجوان پڑوسن کھڑی تھی اور اس کی انگلیوں کے درمیان ایک ٹیلیگرام پھڑپھڑا رہا تھا۔

"اندر آ جائیے۔ بیگم کچن میں ہیں۔"

انہوں نے کچن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن نوجوان پڑوسن اندر آنے کے بجائے دروازے کے باہر ہی کھڑی رہی۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پروفیسر کی جانب ٹیلیگرام بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا اسے پڑھ دیجئے۔ شاید انہیں کا ٹیلیگرام ہے۔ نہ جانے وہ آئے کیوں نہیں۔ عید کو صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ آج تو ان کے آنے کی بات تھی!"

نوجوان پڑوسن نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی دلی بے چینی جھانک رہی تھی۔

پروفیسر مختار نے لفافہ چاک کر کے ٹیلیگرام باہر نکال لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہیں ایسا

محسوس ہوا جیسے ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو اور وہ خلا میں معلق ہو گئے ہوں۔ زندگی

کے اس المیئے پر ان کا نرم اور حساس دل کانپ کر رہ گیا۔

"your husband expired" انھوں نے ٹیلیگرام کے ان سنگدل اور قاتل الفاظ کو ایک

بار پھر اپنی خاموش نگاہوں سے پڑھا اور اس ٹریجیڈی پر ان کا دل رو اٹھا۔ ان کے لئے نوجوان پڑوسن کو اس کے

شوہر کے انتقال کی خبر سنانی مشکل ہو گئی۔ یہ منحوس خبر سنا کر وہ کس طرح اس کے ارمانوں کا خون کر دیں؟

یہ جان لیوا خبر سنا کر وہ کس طرح اس کے پُر شباب اور پُر بہار زندگی میں آگ لگا دیں؟ نہیں نہیں وہ ہرگز

یہ منحوس خبر اسے نہ سنا سکیں گے ——!"

پروفیسر مختار نے دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ یہ ٹیلیگرام کہاں سے آیا ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟ پڑوسن کی آواز سنکر

پروفیسر مختار چونک اٹھے اور انھوں نے کامیاب ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا ——

"یہ ٹیلیگرام راورکیلا سے آیا ہے۔ آپ کے شوہر کو چھٹی نہیں ملی اس لئے انھوں نے عید کے موقع

پر گھر آنے سے معذوری ظاہر کی ہے!"

انھوں نے بہت ہوشیاری سے ٹیلیگرام کو تہہ کر کے جیب کے اندر ڈال لیا اور وہیں سے چلاتے

ہوئے کچن کی جانب چل پڑے ——

"بھئی بیگم! دیکھئے آپ سے ملنے کون آیا ہے!"

لیکن بیگم کے آنے سے پہلے ہی خلاف معمول تیزی سے کچن تک کا فاصلہ طے کر کے وہ بیگم کے پاس پہنچ گئے

اور ان کے کان میں مدھم لہجے میں کہا ——

"نوجوان پڑوسن دروازے پر کھڑی ہے۔ ٹیلیگرام پڑھوانے آئی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ

اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ ذرا اس کی دلجوئی کیجئے۔"

یہ سن کر بیگم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ گرم گرم چائے کے چھینٹوں نے ان کے پیروں میں سوزش پیدا کر دی۔ لیکن اس کی پروا کئے بغیر وہ جلدی سے اٹھیں اور پڑوسن سے ملنے کیلئے دروازے کی جانب چل پڑیں۔ وہ کچن ہی کی طرف آ رہی تھی۔

کچن میں واپس پہنچ کر بیگم نے چائے کی دو پیالیاں تیار کر کے اپنے شوہر اور پڑوسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

" بہن! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ ہم لوگ مل جل کر عید منائیں گے۔ آپکو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔"

بیگم نے پڑوسن کو مخاطب کرتے ہوئے انکی دلجوئی کے طور پر کہا اور انکے اس ہمدردانہ رویّے پر پروفیسر مختار کا دل خوشی سے کھِل اٹھا۔

" آپ چائے پی کر اپنا مکان لاک کر آیئے۔ ہم تینوں اسی وقت بازار جائینگے۔ آپ آج ہی اپنی پسند کے کپڑے لے لیں۔ پرسوں ہی تو عید ہے —— !؟"

پروفیسر مختار نے نوجوان پڑوسن کو مخاطب کرتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

" بھائی جان! آپ فکر نہ کریں۔ میں پرانے کپڑوں میں ہی عید منا لوں گی۔ میں خواہ مخواہ آپ پر بوجھ ڈالنا پسند نہیں کرتی۔"

پڑوسن نے انکار کرتے ہوئے خوددار لہجے میں کہا۔

" پگلی! تم ایک ساڑی کے بوجھ کا ذکر کر رہی ہو، میں تو ساری زندگی کیلئے اپنی بہن کا بوجھ اٹھانے کیلئے تیار ہوں!"

پروفیسر مختار نے جواب تک کتنی ہی بیواؤں اور کتنے ہی حاجتمندوں کی درپردہ مدد کر چکے تھے اٹھ کر نوجوان پڑوسن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا اور انکی بات کی گہرائی تک پہنچے بغیر پڑوسن کی پلکوں پر محبت اور ممنونیت کے دو آنسو لرز اٹھے!

عید نمبر "واسطہ" آسنول ۱۹۷۸ء

چمکیلی دھوپ

اجنبی نے جیب سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر ایک بار پھر غور سے اُس پر لکھا ہوا پتہ دیکھا اور دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اُس کے سامنے ایک جوان، صحت مند اور خوبصورت عورت کھڑی اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے پُراسرار خاموشی میں گزر گئے۔ آخر اجنبی ہی نے پہل کرتے ہوئے کہا ــــ

"میں آپکے شوہر سے مل کر آرہا ہوں!"

"کیا کہا؟ میرے شوہر سے مل کر آ رہے ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ بخیر تو ہیں ــــ!؟"
پانچ سال کی طویل مدت کے بعد اپنے شوہر کے متعلق سن کر عورت پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔
اُس کی آنکھوں سے مسرت کی کرنیں پھوٹ پڑیں اور دل کی دھڑکنوں نے سینے میں جذبات کا تلاطم پیدا کر دیا۔
اجنبی خاموشی سے اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا۔

"آپ اندر آیئے نا، باہر کیوں کھڑے ہیں!؟"

جوان عورت نے دروازے سے ہٹ کر اُسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اُس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جاکر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگر وہ چاہتا تو اسی لمحے جیب سے

نہ لفافہ نکال کر عورت کے حوالے کر دیتا اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن ایسا کرکے وہ اس کا دل نہ توڑنا چاہتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اسے اپنا فرض تو نبھانا ہی ہوگا۔ آخر یہ عورت کب تک ایک سنگدل اور بے وفا مرد کا انتظار کرتی رہے گی جو اسے چھوڑ کر ہر شام ایک نئی لڑکی کے ساتھ بار میں جا کر شراب پیتا ہے اور ساری رات دادِ عیش دیتا ہے۔

یہ عورت کتنی معصوم اور بھولی ہے! اسے کیا معلوم کہ جس مرد کو دیوتا سمجھ کر پانچ برسوں سے اس کا انتظار کر رہی ہے وہ بے وفا، ظالم اور فریب کار ہے۔ اسے کیا معلوم کہ جس بے وفا کی یاد کو زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھ کر اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے وہ کبھی بھولے سے بھی اسے یاد نہیں کرتا۔ اسے کیا خبر کہ جس سنگدل باپ کی نشانی کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اسے کبھی اپنے بیٹے کی یاد تک نہیں آئی! یہ تو نہ جانے کب تک اُس کا انتظار کرتی رہتی اور نہ جانے کب تک وہ اسے تنہائی کی آگ میں جلتی ہوئی چھوڑ کر لندن کی بہکی ہوئی جوانیوں سے کھیلتا رہتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ اپنے کاروباری سلسلے میں لندن پہنچا تو اچانک ایئرپورٹ ہی پر قیصر سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک بے حد خوبصورت نوخیز لڑکی تھی جس کا کوئی رشتہ دار اسی فلائٹ سے آنے والا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے وہ اُس فلائٹ سے نہ آسکا۔ اچانک زینوں سے اُترتے ہوئے قیصر نے اُسے دیکھ کر فوراً پہچان لیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ وہ اصرار کرکے اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ٹیکسی لندن کی کشادہ سڑکوں سے گزرتی رہی اور سربفلک پُرشکوہ بلڈنگیں تیزی سے ایک دوسرے میں جیسے مدغم ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی قیصر اور ہیلن کے بے تکلف قہقہے گونج اٹھتے۔ تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگتا اور پھر لندن کے خوبصورت مناظر میں کھو جاتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ٹیکسی ایک شاندار بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ قیصر اسے اور ہیلن کو دوسری منزل پر لے گیا جہاں اُس نے کرایہ پر دو کمرے لے رکھے تھے۔

اُس کی وہ شام برباد ہو گئی کیونکہ جس کاروباری مقصد کے تحت وہ لندن پہنچا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ قیصر اصرار کرکے اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں ان تینوں نے پُرتکلف ناشتہ کیا۔

وہاں سے نکل کر وہ اسے اور ہیلن کو ایک بار میں لے گیا اور بیرے کو ایک پیگ شیمپین اور دو پیگ وہسکی کا آرڈر دیا۔ لیکن اس کے انکار اور سخت احتجاج پر قیصر کو اس کے لئے وہسکی کا آرڈر کینسل کرکے ایک ہاٹ کافی لانے کے لئے کہنا پڑا۔

قیصر اور ہیلن جام سے جام ٹکرا کر آہستہ آہستہ چسکیاں لیتے رہے اور آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں مخمور ہوتی گئیں۔ جب جذبات بہکنے لگے تو قیصر اسے اور ہیلن کو لے کر بار سے نکل آیا۔ باہر آتے ہی ہیلن بہت بے تکلفی سے اس سے لپٹ گئی۔ اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گداز باہنوں سے آزاد کرایا۔

اس کے اس انداز پر قیصر اور ہیلن کا بے ساختہ قہقہہ گونج اٹھا۔ گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روک کر وہ گھر پہنچے اور وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اس ماحول سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ پہلے کمرے میں ریکارڈ بج رہا تھا۔ قیصر اور ہیلن ریکارڈ کی دھن پر رقص کر رہے تھے۔ کبھی کبھی دراز دبی اور جوان قہقہوں کی آواز ماحول میں ہلچل سی پیدا کر دیتی۔ وہ ان جذبات انگیز آوازوں سے بچنے کے لئے کچن میں چلا گیا اور بریڈ اور بٹر نکال کر توسٹ بنانے لگا۔

دوسرے دن قیصر کو فرصت تھی۔ اس نے ناشتے کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ــــ

"قیصر! تم نے اپنے پچھلے خط میں مجھے لکھا تھا کہ تم نے اب مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کر لی ہے اور پانچ سال سے ہندوستان نہیں گئے۔"

"ہاں دوست! یہاں دل لگ گیا ہے۔ اب وہاں کیا رکھا ہے؟"

"تمہاری بیوی؟ تمہارا بچہ ــ!؟"

"انہیں کسی نے سنبھال ہی لیا ہوگا۔ کیا تمہارا خیال ہے صبیحہ پانچ سال سے میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی!؟"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔"

"نہیں دوست! عورت بہت بے وفا ہوتی ہے! وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے زندہ رہنے

کے لئے ایک سہارا چاہئے!"

"قیصر! ایک مشرقی عورت کے متعلق تمہارا یہ نظریہ سراسر غلط ہے۔ ایک مشرقی عورت تو ایثار کا پیکر اور وفا کی دیوی ہوتی ہے —— تم جو زندگی گزار رہے ہو اس کا انجام بربادی کی طرف جاتا ہے۔ اس لئے جتنی جلدی ہو سکے اپنی بیوی اور بچے کو یہاں لے آؤ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ اب میں وہاں لوٹ کر جا سکتا ہوں نہ انہیں یہاں بلا سکتا ہوں۔"

"اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس بے چاری کو انتظار کی آگ سے نکال کر جینے کا بہتر موقع دو؟"

"ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں۔"

"میں کل واپس چلا جاؤں گا۔"

"میں آج ہی یہ کام کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے قیصر اسے تنہا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بھی دروازہ لاک کیا اور اپنے کاروباری سلسلے میں چل پڑا۔

شام کو جب قیصر واپس آیا تو اس کے ساتھ ہیلن کی بجائے ایک دوسری لڑکی تھی۔ ہیلن کی طرح اس کے بال سرخ نہیں سیاہ تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی ساون کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ وہ نشے کے عالم میں بار بار قیصر سے لپٹ جاتی تھی۔

"زندگی کا لطف اس میں نہیں کہ اسے ایک ہی عورت کیلئے وقف کر دیا جائے دوست! یہ لو! میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔"

قیصر نے اس لڑکی کو چومتے ہوئے بے پروائی سے کہا اور اس کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے اس مدہوش لڑکی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ طلاق نامہ تھا۔ ایک مظلوم اور بے زبان عورت کی قسمت کا فیصلہ!

اُس کے پانچ سال کے انتظار کا پھل!!

اُسے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ عورت جا کر اپنی ماں کو بلا لائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پھر داخل ہوتے ہوئے اُس نے خوشی سے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

" امی! دیکھیے یہی صاحب اُن سے مل کر آ رہے ہیں۔"

یہ آواز سن کر وہ اچانک تخیلات کی دنیا سے لوٹ آیا۔ اُس کے سامنے ایک معمر اور پروقار خاتون تھیں تقریباً پانچ سال کا ایک خوبصورت اور معصوم بچہ اُن کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔

اُس نے جلدی سے کرسی سے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ بڑی بی نے اُسے ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اُس معصوم بچے کی طرف دیکھنے لگا۔

" یہ میرا بدنصیب نواسہ ہے جو پیدا ہوتے ہی باپ کی محبت کو ترس گیا۔ اِس کے پیدا ہونے کے چند ہی دنوں کے بعد اِس کا باپ لندن چلا گیا جہاں اس کے کسی دوست نے اُس کے لئے مِل میں نوکری کا بندوبست کر دیا تھا۔ ایک سال تک تو اُس کے خط آتے رہے۔ کبھی کبھی روپے بھی آ جاتے تھے۔ لیکن پھر اُس کا کوئی خط آیا اور نہ اُس نے کوئی رقم بھیجی۔ مجھے تنہا گھر کا سارا خرچ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اِس سال میں بھی اسکول سروس سے ریٹائر ہو رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ میرے داماد کو ایسے میں اپنی بیوی اور بچے کی یاد آ گئی اور اُس نے آپ کو یہاں بھیج دیا۔ کیا آپ انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے ہیں؟ بھلا وہ کیوں نہیں آیا—!؟"

" اب وہ کبھی نہ آئے گا!"

بڑی بی کی طویل گفتگو سے گھبرا کر اُس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور جیب میں پڑا ہوا لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔

طلاق نامہ پڑھنے کے بعد اچانک بڑی بی ذرا غم سے سسک اٹھیں اور انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —

"صبیحہ! تو لٹ گئی! آج تو بیوہ ہو گئی! تیرا بچّہ یتیم ہو گیا!!"

صبیحہ نے جھک کر اپنی ماں کے ہاتھ سے طلاق نامہ لے لیا۔ جب وہ اسے پڑھ چکی تو بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ پڑے اور اُس نے بازوؤں میں منہ چھپا کر گھُٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"امّی! میں تو پانچ سال پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ ایک آس تھی وہ بھی آج ٹوٹ گئی!"

اس المیہ نے اُسے بے حد متاثر کیا۔ اُس نے اچانک کرسی سے اُٹھ کر روتے ہوئے بچّے کو اپنی گود میں لے لیا اور عورت کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں؟ آپ کا بچّہ بہت پیارا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔۔!؟"

عورت نے چونک کر آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں حیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں!! شانے پر پڑے ہوئے اجنبی کے توانا ہاتھ کی گرمی سے اُس میں عجیب نئی توانائی پیدا ہو گئی۔ اُس کی زندگی کے افق پر چھائے ہوئے غم کے بادل چھٹ گئے اور اچانک اُس کی نگاہوں کے سامنے چمکیلی دھوپ بکھر گئی۔

بیسویں صدی، نئی دہلی

دسمبر ۱۹۷۸ء

لتا جب پیدا ہوئی تو اُس کے والدین نے بہت خوشی منائی۔ لیکن پانچویں دن جب اُسے نہلایا جا رہا تھا تو اچانک اُس کی ماں کی نگاہ اُس کے سینے پر پڑی جہاں ہلکی ہلکی ایک لکیر اُبھری ہوئی تھی۔ اُس کی ماں نے کپڑے میں صابن لگا کر اُس داغ کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لکیر اسی طرح قائم رہی۔ لتا کے سینے سے وہ داغ تو نہ مٹا سکا لیکن اُس کا باپ اسی دن اچانک مر گیا۔

اسی دن سے وہ منحوس سمجھی جانے لگی۔ جب وہ چھ سال کی ہو گئی تو اُس کی ماں نے اُسے ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ وہ مہینے میں صرف ڈیڑھ دن کے لئے گھر آیا کرتی تھی۔

وقت کا طائر پرواز کرتا رہا اور لتا انیس سال کی ہو گئی۔ اُس نے بی۔ اے پاس کر لیا اور اُس کی شادی اُس کے ہم جماعت اشوک سے ہو گئی۔ اشوک اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ لیکن شادی کے تیسویں دن اچانک اُس کی موت ہو گئی۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ قریباً رات کے بارہ بجے کسی زہریلے سانپ کے ڈسنے سے اُس کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ سن کر لتا سوگوار ہو گئی اور اب اُسے خود بھی اپنے منحوس ہونے کا یقین ہو گیا۔

دوسرے دن باتھ روم میں نہاتے وقت اُس نے اپنے سینے کی لکیر کو غور سے دیکھا تو اچانک وہ اس بات سے خوفزدہ ہو گئی کہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ وہ لکیر اور نمایاں ہو گئی تھی اور اُس کی شکل پھن پھیلائے ہوئے کسی ناگ سے ملتی جلتی تھی۔ اُس نے اسی دن یہ بات اپنی ماں کو بتا دی۔

یہ سن کر اُس کی ماں کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے سینے پر سے بلاوز ہٹایا تو سنگ مرمر جیسے صاف و شفاف سینے کی محرابوں کے درمیان ایک بل کھاتے ہوئے ناگ کی تصویر دیکھ کر وہ خوف سے کانپ اٹھی۔ لتا اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور اسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ لیکن آج اُسی لتا سے اُسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ لتا کے سینے سے اُس داغ کو کھرچ ڈالے یا کاربولک ایسڈ یا کسی دوسرے سب طریقے سے اُسے مٹا دے۔ لیکن اس کا انجام تو وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس لئے اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ آخر کئی دنوں کی شدید الجھن کے بعد اُسے یکایک خیال آیا کہ اُس کی کوٹھی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بوڑھا سپیرا رہتا ہے جو سانپوں کو پٹاری میں پالتا ہے اور کبھی کبھی لوگوں کے گھروں سے آوارہ سانپوں کو بھی نکالتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے منی بیگ اٹھایا اور اُس سے ملنے کے لئے چل پڑی۔ جب وہ وہاں پہنچی اس وقت سپیرا اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر کے کہیں جانے والا تھا۔ اُسے پہچانتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سنا ہے تم گھر میں گھسے ہوئے آوارہ سانپوں کو نکالنے میں ماہر ہو—!؟"

"جی مالکن! آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور کہیں۔"

"میں اسی وقت اسی لئے آئی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے گھر میں کہیں نہ کہیں کوئی زہریلا ناگ موجود ہے جو — — جو —"

"آپ رک کیوں گئیں مالکن! مجھ پر اور پر اعتماد کیجئے اور آگے کہیے۔"

اور اُس نے لتا کی دکھ بھری داستان سپیرے کو سنا دی۔ لتا کی دکھ بھری کہانی سننے کے بعد سپیرے نے دوسرے دن کوٹھی پر پہنچنے کا وعدہ کیا۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھماتے ہوئے وہاں سے واپس آگئی۔

دوسرے دن اُس نے رازداری کے خیال سے صبح ہی سے نوکروں کو چھٹی دے دی اور سپیرے

کا انتظار کرنے لگی ۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد سپیرا اپنا تھیلا لئے ہوئے آپہنچا۔ اُس نے لتا کی طرف دیکھا تو اچانک اس کی بھنویں تن گئیں۔ پھر وہ ڈرائنگ روم کے فرش پر بیٹھ گیا اور تھیلے کے اندر سے تومڑی نکال کر لتا کی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا اشارہ ملتے ہی اس نے تومڑی کو اٹھا کر اپنے منھ سے لگالیا اور بڑی مہارت سے جھوم جھوم کر اسے بجانے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے مایوس ہو کر تومڑی کو پھر تھیلے کے اندر ڈالدیا اور لتا کی ماں سے بولا ــــ

"مالکن! میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ چھوٹی مالکن ــ"

"کہو کہو، رک کیوں گئے؟ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ چھوٹی مالکن ناگن نہیں ہیں!؟"

"ہاں مالکن! مجھے یہی اندیشہ تھا کیونکہ جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے چھوٹی مالکن کے جسم سے کسی ناگن کی ہلکی ہلکی بو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن اب میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ بچپن میں لتا بیٹیا کو ضرور کسی ناگن نے کھلایا ہوگا جو بعد میں اپنے آپ مرگئی یا کسی نے اُسے مار ڈالا۔ اور اس کے مرنے کے بعد اُس کا ساتھی ناگ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی لتا بٹیا کو بھی اُس سے الگ کردے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے تیسویں ہی دن اشوک بابو ــــــ!

"بند کرو یہ بکواس۔" لتا کی ماں نے سپیرے کی بات کاٹ کر جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بی بی جی! جانے سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ چھوٹی مالکن کے لئے اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ اب یہ ساری زندگی اسی طرح گزار دیں یا اگر شادی کریں تو شادی کے تیسویں دن رات کے ٹھیک بارہ بجے اپنے سینے پر ابھری ہوئی سیاہ لکیر کو الگ کردیں ورنہ ــــــ"

جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر بوڑھے سپیرے نے اپنا تھیلا اٹھایا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

لتا کے کزن ڈاکٹر نریش کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے تیسرے ہی دن اُس سے شادی کرلی تاکہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر لتا کو بچالے۔

سہاگ رات کو جب نریش نے دلہن کے سجے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ لتا سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی سمٹی سمٹائی پلنگ پر بیٹھی تھی۔ نریش کے قدموں کی آہٹ پر اس نے چونک کر گردن اٹھائی تو اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف و ہراس کے گہرے سائے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گلاب کی اُس سرخ کلی کے پاس آ پہنچ گیا اور اُس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ کر آہستہ سے اُس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ خوف کی لہروں نے امید کے سمندر میں دم توڑ دیا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور لتا کے مرمریں ہاتھوں کو تھام کر اُس کی خوبصورت آنکھوں کے جام میں ڈوب گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی طرح انتیس دن گذر گئے۔ تیسویں دن لتا بے حد اداس تھی۔ نریش بھی اداس تھا آج کی رات اُس کے لئے موت کا جام لے کر آنے والی تھی۔ وہ دن بھر مصروف رہا۔ اور جب دن بھر کا تھکا ماندہ سورج آخری ہچکی لے کر مغرب کی آغوش میں چھپ گیا تو نریش نے لتا کو آہستہ سے اپنے سینے سے الگ کیا اور اسے تسلی دیتا ہوا اسپتال کی جانب چل پڑا جہاں رات کے بارہ بجے اُس کا آپریشن ہونے والا تھا۔

اسپتال پہنچ کر ڈاکٹر نریش نے اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے ضروری مشورہ کیا اور نرسوں کو ہدایت دے کر آپریشن تھیٹر کا معائنہ کیا۔ ہر طرح مطمئن ہونے کے بعد ڈاکٹر نریش اپنی کوٹھی واپس آ گیا اور لتا کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ اسپتال پہنچ گیا۔ اُس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد اس کے لئے موت کا جام بھرا جانے والا تھا۔ یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں امید و بیم کے سائے لہرانے لگے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے لتا کو آپریشن تھیٹر میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نریش پہلے ہی سے اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ مستعد تھا۔ بوڑھے سپیرے کی ہدایت کے مطابق اُسے ٹھیک رات کے بارہ بجے لتا کے سینے پر ابھری ہوئی خوفناک لکیر کو مٹا دینا تھا ورنہ ــــ ورنہ ــــ!

گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ ڈاکٹر نریش کے دل کی دھڑکنوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لتا کو بے ہوش کر کے اُس کے سینے سے کپڑا ہٹا دیا گیا۔ اور جیسے ہی رات کے بارہ بجے

اچانک ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ آپریشن تھیٹر کے اندر موجود نرسیں اور ڈاکٹر سہم اٹھے۔ لیکن ڈاکٹر نرلیش نے بہت پھرتی اور مہارت سے آپریشن کر کے لتا کے سینے سے اُس خوف ناک لکیر کو الگ کر دیا۔ اور اُس لکیر کے الگ ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کراہ کر آپریشن تھیٹر کے دروازے پر گر پڑا ہو!

رات کے دو بج چکے تھے۔ لتا ہوش میں آ چکی تھی۔ اُس کے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر نرلیش چونکا اور آہستہ آہستہ آپریشن تھیٹر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دوسرے ڈاکٹروں اور نرسوں نے اُسے روکنا چاہا لیکن اُس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ دروازے پر ایک خوفناک ناگ مُردہ پڑا تھا جس کا سینہ چیرا ہوا تھا۔

بوڑھے سپیرے کی بات سچ ثابت ہوئی تھی اور موت کا جام، ڈاکٹر نرلیش کے لبوں تک آ کر دور ہو گیا تھا!!

بیسویں صدی، نئی دہلی

افسانہ نمبر

مئی ۱۹۷۹ء

ڈوبتے سورج کا کرب

ایک بھی رستہ

جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا۔ اس بار بھی وہی حادثہ پیش آیا جو اس سے پہلے کئی بار پیش آ چکا تھا۔ لوگ دیکھنے آئے تھے بڑی کو اور انہیں پسند آ گئی چھوٹی۔ عذرا تھی ہی بدنصیب! کہتے ہیں نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھتے ہی بدصورت لڑکی کا شباب بھی نکھر جاتا ہے، اس کے چہرے کی کالی رنگت میں بھی جاذبیت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن عذرا کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ آج تک اس کے شباب کا جادو کسی پر نہ چل سکا اور نہ ہی کوئی نوجوان اس کی نگاہوں کے تیر سے زخمی ہوا۔

اُس دن پھر اسے کچھ عورتیں دیکھنے آئی تھیں۔ اُس کی ماں اور چھوٹی بہنوں نے اسے خوب سنوارا تھا۔ لیکن خوشنما لباس اور گہرا میک اپ بھی اسے خوبصورت اور پرکشش نہ بنا سکا۔ مہمان عورتوں نے اُس کی بجائے اُس کی چھوٹی بہن زہرہ کو پسند کیا۔ لیکن اس کا رشتہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ قسمت کے اس کھیل پر عذرا کا دل خون خون ہو گیا اور اس کا جی چاہا کہ زہرہ کے رخساروں کی شادابی نذر آتش کر دے اور اس کی نرگسی آنکھوں کا سارا حسن نیست و نابود کر دے۔ لیکن ــــ بھلا اس میں اُس بے چاری کا کیا قصور ہے!؟ اُس نے سوچا ــ تو ــــ تو ـــ؟ یہ ایک لفظ ایک چبھتا ہوا سوال بن کر تیزی سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا اور اس کی کرخت گونج سے اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے۔

اور تب اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ساری زندگی کنواری رہے گی اور یہ فیصلہ کرتے ہی اُس کے تنے

ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑگئے اور اس کا پریشان ذہن پرسکون ہوگیا۔ لیکن سکون حاصل ہوتے ہی اُسے اپنے دل میں درد بھری ٹیسیں محسوس ہوئیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام کر ڈاکٹر شہاب کے تصور میں کھو گئی۔ اُس کے دل کے آئینے میں ڈاکٹر شہاب کا مسکراتا ہوا چہرہ اُبھر آیا اور نگاہوں کے سامنے پہلی ملاقات کا منظر کسی فلم کی طرح گھومنے لگا جب اچانک دل کے پُرسکون سمندر میں جذبات کی تیز و تند لہریں مچل اٹھی تھیں ــــ

اُس دن اُسے اچانک بہت تیز بخار ہوگیا تھا۔ درد کی شدت سے سر پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ اُس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں موند لیں۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر سب لوگ پریشان ہوگئے اور گھر میں بھاگ دوڑ مچ گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا جلتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی کلائی پر اپنی نرم انگلیاں رکھ دی ہوں۔ اُس نے بہت مشکل سے اپنی بوجھل پلکوں کو اٹھا کر دیکھا۔

ڈاکٹر شہاب اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور اُس کی کلائی پر اپنی انگلیاں رکھے بخار کی کیفیت محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُس نے پوچھا ــــ

"کیسی طبیعت ہے؟"

"سارا بدن جل رہا ہے اور سر بہت بوجھل محسوس ہو رہا ہے"۔ اُس نے نحیف آواز میں کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بہت جلد اچھی ہوجاؤگی۔ میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا اور نسخہ لکھ کر چلا گیا۔

پہلے ہی کیپسول کے بعد اس کا بخار آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ دوسرے دن بخار بالکل اُتر گیا اور جلد ہی وہ بالکل نارمل ہوگئی۔ بخار باقی رہا اور نہ سر کا درد۔ لیکن اچانک وہ ایک نئی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں سے منڈلا کر خلاؤں میں بھٹکنے لگی جب دن کے سارے کام کاج سے فارغ

ہو کر وہ رات کو بستر پر تو جاتی تو تنہائی میں ڈاکٹر شہاب مسکراتا ہوا اُس کے خیالوں میں آ بستا۔ وہ جھلتی اٹھتی اور مایوس ہو کر اس کے تصور کو اپنے ذہن کے پردے سے جھٹک دیتی۔ لیکن ڈاکٹر شہاب کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر اُبھر آتا، کبھی اُس کے ذہن کے پردے پر اور کبھی اُس کے دل کے آئینے میں۔ اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

چمکتے ہوئے چاند کی تمنا کرنے سے بھلا آج تک کسی کو چاند ملا ہے؟ سماجی اعتبار سے ڈاکٹر شہاب بھی اس کے لئے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند سے کم نہ تھا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے نہ دیکھا تھا۔ اس نے بھی کبھی ڈاکٹر شہاب کے متعلق کسی غلط زاویے سے نہ سوچا تھا۔ لیکن اس بار کی بیماری نے نہ جانے کس طرح اسے ڈاکٹر شہاب کے اتنا قریب کر دیا تھا کہ اس کے تصور میں ہر وقت اس کی تصویر مسکراتی رہتی تھی۔ وہ اس کے خیال سے دامن چھڑانے کے لئے زور سے سر کو جھٹک دیتی۔ لیکن تصور کے صاف و شفاف آئینے میں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر اُبھر آتا۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی۔ ادھر کئی دنوں سے اُس کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

اُسے پھر کچھ عورتیں دیکھنے کے لئے آنے والی تھیں۔ جب اُسے یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے سختی سے شادی سے انکار کر دیا۔ لیکن والدین کی ضد کے آگے اُسے ایک بار پھر مجبور ہونا پڑا۔ عورتیں اُسے دیکھنے کے لئے آگئیں۔ اُس کی چھوٹی بہنوں نے اُس کے چہرے کے سانولے پن کو گہرے میک اپ میں چھپانا چاہا۔ لیکن اس نے میک اپ کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ مہمان عورتوں نے اسے پسند کر لیا ہے!

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لڑکے کی ماں نے جہیز کی بات چھیڑ دی۔ جہیز میں دیے جانے والے مروجہ سامان کے علاوہ اس نے نقد پانچ ہزار روپیوں کی بھی فرمائش کر دی۔

"دیکھئے، میں آپ سے کسی طرح کی سودے بازی نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے اپنے لڑکے کے لئے واقعی آپ کی لڑکی پسند ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ پانچ ہزار روپیوں کے بغیر یہ شادی نہ ہو سکے گی

کیونکہ اتنی ہی رقم پیش کرنے پر میرے لڑکے کو فیکٹری میں کوئی کام مل سکتا ہے۔"

اس کی ماں کو سوچتے ہوئے دیکھ کر لڑکے کی والدہ نے کہا۔ اور جب عذرا کے والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو

انہوں نے مایوس لہجے میں کہا۔

"میرے لئے تو جہیز ہی کا انتظام کرنا مشکل ہے۔ میں پانچ ہزار روپے کہاں سے لاؤں گا!؟"

"بھائی جان! اگر آپ چاہیں تو پانچ ہزار روپے بطور قرض دے کر ہماری مشکل آسان کر سکتے ہیں۔ عذرا کا

نصیب ہی برا ہے۔ کتنی مشکل سے تو اس بار اسے پسند کیا گیا ہے۔"

عذرا کی ماں نے اپنے بڑے بھائی رحمٰن صاحب کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ اگر لڑکا پسند آجائے تو میں انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس رقم کی ادائیگی

کی کیا صورت ہوگی؟ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ ان دنوں میرا کاروبار بہت مندا ہے۔"

عذرا کے ماموں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا جرانہ داؤ پیچ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ نوشاد کے لئے کئی جگہ لڑکیاں دیکھی گئی ہیں۔ اب میں بھی اسی

نئے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اپنے لڑکے کی شادی ایسی جگہ کروں گا جہاں سے جہیز کے علاوہ کم سے کم پانچ ہزار

روپے نقد ملیں گے۔ اس طرح میں فوراً آپ کا قرض ادا کر دوں گا!"

عذرا کے بوڑھے اور تجربہ کار باپ نے اس طرح مسکراتے ہوئے کہا جیسے اس نے زمانے کی دُکھتی رگ پر

انگلی رکھ دی ہو!

تین ماہ کا عرصہ جیسے پر لگا کر اُڑ گیا۔ ایک بڑا سا شامیانہ برقی قمقموں اور رنگین غباروں

سے آراستہ تھا۔ براتیوں کی بھیڑ میں دو دو لہے گاؤ تکیے کے سہارے قبلہ رُو بیٹھے ہوئے تھے۔

زہرہ کا دولہا سرخ و سپید رنگت، دلکش چہرے اور مردانہ وجاہت کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں

کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن عذرا کی طرح اُس کا دولہا بھی کالا تھا۔ خدوخال بھی اچھے نہ تھے جس کی وجہ سے

اس کے چہرے پر پڑنے والی ہر نگاہ پلٹ کر زہرے کے دولہے پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

ادھر یہ کھیل جاری تھا کہ لڑکے کے والد نے عذرا کے والد کو ایک طرف لے جا کر اُن کے کان میں پُر معنی لہجے میں کہا۔

"نکاح کا وقت قریب ہے!"

"بھائی صاحب! بس تھوڑی دیر اور صبر کیجئے۔ عذرا کے ماموں رقم لے کر آتے ہی ہوں گے۔"

عذرا کے والد نے بہت عاجزی سے کہا۔ اُسی وقت رحمٰن صاحب لپکتے ہوئے اُن کی طرف بڑھے۔ اُن کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ انہوں نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب! میں بے حد شرمندہ ہوں کہ رقم کا انتظام نہ کر سکا۔ کلکتہ کی جس پارٹی نے رقم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ آئی ہی نہیں!"

یہ سنتے ہی عذرا کے والد کو چکر سا آگیا اور وہ غش کھا کر گرنے ہی والے تھے کہ ڈاکٹر شہاب نے انہیں سنبھال لیا۔

"اب یہ شادی نہ ہوگی۔ آپ نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔ میں بارات واپس لے جا رہا ہوں۔"

لڑکے کے والد نے تیور بدل کر کہا۔ عذرا کے والد نے انہیں روکنا چاہا۔ لیکن ان کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور وہ بے بسی سے براتیوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

اسی وقت سلمٰی دوڑتی ہوئی آئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ابّو جان! جلدی چلئے' عذرا باجی بے ہوش ہو گئی ہیں!"

یہ سن کر عذرا کے والد بدحواسی کے عالم میں گھر کی طرف چل پڑے۔

دوسری برات کے لوگوں کو سمجھا بجھا کر ڈاکٹر شہاب بھی عذرا کو دیکھنے کے لیے چل پڑا۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا عذرا عروسی جوڑے میں ملبوس اپنی ماں کی گود میں

بے ہوش پڑی ہے اور چاروں طرف سے عورتیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب نے بہت مشکل سے دوسری عورتوں کو ہٹایا۔ صرف گھر کی چند عورتیں رہ گئیں۔ اُس نے عذرا کے خاموش چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسے ہوش آگیا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے دل میں درد بھری ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور سر بے حد وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ انتہائی صدمے اور مایوسی کی وجہ سے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس نے بہت مشکل سے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! بارات واپس چلی گئی نا؟ یہ لوگ زبردستی میری شادی کرنی چاہتے ہیں۔ بھلا مجھ جیسی کالی اور بدصورت لڑکی سے کون شادی کرے گا؟"

شدید قلبی اور ذہنی صدمے سے اس پر پھر دل کا دورہ پڑنے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں ڈاکٹر شہاب کی آواز گونج اٹھی۔

"عذرا! آنکھیں کھولو عذرا! تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم بدصورت ہو؟ میں تم سے شادی کروں گا ابھی ——— اسی وقت ——— ! تمہیں اعتراض تو نہیں؟"

اور ان الفاظ نے عذرا پر اس طرح جادو کا اثر کیا کہ اُس کا جاتا ہوا ہوش لوٹ آیا۔ اُس نے بے حد جذباتی انداز میں ڈاکٹر شہاب کا ہاتھ چوم لیا اور اُس کے لبوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ کھل اٹھی۔

بیسویں صدی، نئی دہلی

فروری ۱۹۸۰ء

ڈوبتے
سورج کا کرب

زندگی مسکرائی

انجینئر صاحب لاکھ آزاد خیال اور وسیع النظر سہی مگر بھلا وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتے تھے کہ اُن کا لڑکا اُن کی مرضی کے بغیر بہو بیاہ کر گھر لے آئے!

جون کی تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ اُن کی اور بیگم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے پنکھے کھول کر سوئی ہوئی تھیں۔ اسلئے کال بیل کی آواز سن کر انہوں نے ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور۔ اور دروازہ کھولتے ہی وہ یکبارگی چونک اٹھے۔ انہوں نے پلکوں کو جھپک کر دیکھا۔ لیکن وہ یقیناً کوئی خواب نہیں تھا۔

"ابو جان! تسلیم"

ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ایک نازک ہاتھ پیشانی تک گیا اور مترنم سی آواز گونج اٹھی۔ وہ جواب دے کر حیرت سے اپنے لڑکے پروفیسر ہاشم کی طرف دیکھنے لگے۔

"ابو جان۔ آپ کی بہو ۔۔۔ روزینہ!"

پروفیسر ہاشم نے بہت مشکل سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اور یہ سنتے ہی انجینئر صاحب چیخ اٹھے ۔۔۔

"یعنی کہ تم نے ہمیں بتائے بغیر شادی کر لی۔!؟"

"ابو جان! میں مجبور تھا۔ آپ پوری بات تو سُن لیں۔"

پروفیسر ہاشم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"تم مجبور تھے؟ اور ہم لوگ کیا مر گئے تھے جو تم نے ہمیں بتائے بغیر چپکے سے شادی کر لی!؟"

انجینئر صاحب نے غصے سے بھڑکتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ان کی بیگم اور لڑکی شور سن کر جاگ پڑیں اور دروازے پر آکر حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگیں۔

پروفیسر ہاشم اور روزینہ نے ایک ساتھ ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا۔ بیگم جواب دے کر شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ انجینئر صاحب نے چیختے ہوئے کہا۔

"لڑکے کا سہرا دیکھنے کا بہت ارمان تھا۔ اب بڑھ کر بلائیں کیوں نہیں لیتیں۔!؟"

اور اچانک حقیقت کا علم ہونے کے بعد بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پانی کے تیز بہاؤ کی طرح متضاد جذبات کی لہریں ان کے چہرے پر سے گزر گئیں۔ چند لمحوں تک تو وہ سمجھ ہی نہ سکیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر جب ان کے حواس درست ہوئے تو انہوں نے بیٹے اور بہو کے بازوؤں کو تھام لیا اور انہیں ایک کمرے میں لے جا کر بٹھاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاشم! یہ تم نے کیا کیا؟ کیا ہم لوگ تمہارے دشمن تھے جو تم نے ہم سے چھپا کر شادی کر لی؟"

"امی جان! میں مجبور تھا۔ حالات ہی ایسے پیش آگئے کہ میں ——"

اور اچانک حالات کے آئینے میں پروفیسر ہاشم نے دیکھا کہ ایک لڑکی کالج میں فیس ادا کرنے والے کاؤنٹر پر بہت مغموم اور پریشان سی کھڑی ہے۔ اس کی متوحش نگاہیں بار بار اٹھ کر کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ سامنے صرف چند لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔

"شاید اسے کسی کی تلاش ہے۔ لیکن کس کی اور کیوں؟"

یہ سوچ کر وہ اس کی جانب قدم بڑھا دیتا ہے اور بہت نرم لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"مس روزینہ! آپ کو کس کی تلاش ہے؟ آپ بہت پریشان معلوم ہوتی ہیں۔ کیا میں آپ کی کوئی

مدد کر سکتا ہوں؟"

اور اس اپنائیت پر روزینہ کی دراز پلکوں پر آنسو چمک اٹھتے ہیں۔ وہ کانپتے ہوئے لہجے میں کہتی ہے۔

"سر! ٹسٹ امتحان سے پہلے فیس داخل کرنے کی آج آخری تاریخ ہے اور میرے ابّو ابھی تک نہیں آئے۔ غالباً وہ فیس کا انتظام نہ کر سکے۔ آہ! اب کیا ہوگا؟"

"آپ فکر نہ کیجئے۔ میں آپ کی فیس داخل کر دیتا ہوں۔"

وہ روزینہ کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"لیکن سر! اوہ سر! ذرا سنئے تو ــــــ"

روزینہ جذباتی انداز میں اُس کی طرف لپکتی ہوئی کہتی ہے۔ لیکن وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر اندر جا کر کلرک کے ہاتھ میں فیس کی رقم تھما دیتا ہے اور سنجیدہ انداز میں وہاں سے چل پڑتا ہے۔

کتابِ زندگی کا ایک ورق کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسرے دن کلاس ختم ہونے کے بعد جب سب لڑکے اور لڑکیاں باہر چلے گئے تو روزینہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ سرو جیسے قد، بیضوی چہرے کی شادابی اور متانت اور گل بوٹوں والی سفید ساڑی نے اس کی معصومیت اور دلکشی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

وہ مجسّم سوال بن کر حسن و سادگی کے اس دلکش اور حسین پیکر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کی محویت کے بعد دونوں چونکے تو مس روزینہ نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سر! کل آفس میں فیس کی رقم داخل کر کے آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میرے ابّو بھی آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ لیکن اچانک بیمار پڑ جانے کی وجہ سے وہ روپے کا انتظام نہ کر سکے۔ ابّو اچھے ہو جائیں تو میں جلد ہی آپ کی رقم ادا کر دوں گی۔"

مس روزینہ کی شائستگی اور خودداری نے اسے بے حد متاثر کیا اور اس نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا ــــ

"مس روزینہ! آپ اپنے ابّو سے کہہ دیں کہ وہ اسے قرض نہ سمجھیں۔ میں نے تو انسانی ہمدردی کے ناطے آپ کی مدد کی ہے۔"

"پھر بھی ــــ"

"کچھ نہیں۔ اب آپ جائیے اور ٹسٹ کی تیاری کیجئے۔ اور ہاں اگر آپ کو اپنے ابّو کے علاج کے سلسلے میں رقم کی ضرورت ہو تو بلا تکلّف آکر مجھ سے لے جائے گا۔"

"اوہ سر! آپ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے عظیم ــــ!"

"میرا نام عظیم نہیں ہاشم ہے!"

اس نے مسکراتے ہوئے ذرا بے تکلفی سے کہا اور روزینہ کا کھنکتا ہوا قہقہہ نور کی کرنوں کی طرح اس کے آس پاس بکھر گیا۔

کتاب زندگی کا ایک اور ورق اس کی انگلیوں سے پھسل کر یادوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

اُس دن ٹسٹ امتحان کا آخری پرچہ تھا۔

وہ جیسے ہی اسٹاف روم سے باہر نکلا اس کی نگاہ کاریڈور میں کھڑی مس روزینہ پر پڑی اور اچانک اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"کیا آپ کا کوئی پرچہ نہیں ہے آج؟"

"سر! میں ٹسٹ میں شریک ہی کہاں ہو سکی!؟"

"کیوں؟ آخر کیوں؟ اس نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"سر! میرے ابّو ــــ" روزینہ کے حلق میں آواز گھُٹ کر رہ گئی۔

"اوہ! تمہارے ابو ابھی تک بیمار ہیں؟ اچھا میں کالج سے واپسی میں تمہارے یہاں آؤں گا۔ کہاں رہتی ہو تم؟"
اُس نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

"نیا بازار، کوارٹر نمبر ۶۲۔" روزینہ نے پلکوں پر مچلتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا خدا حافظ!" اُس نے اگزامینیشن ہال کی جانب قدم بڑھا دیئے اور روزینہ سسک کر اپنی آہوں کو سینے میں جذب کر لینے کی کوشش کرنے لگی۔

—— ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کے چھ بجے جب اُس نے کوارٹر نمبر ۶۲ کے دروازے پر دستک دی تو چند ہی لمحوں کے بعد ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اُس کے پیچھے ہی روزینہ کھڑی تھی۔ اُس نے بہت احترام کے ساتھ روزینہ کی امّی کو سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا ——

"میری بیٹی روزینہ نے مجھے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ ہم لوگ آپ کے بہت احسانمند ہیں کہ آپ غریبوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"آپ تو مجھے نادم کر رہی ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ روزینہ کے ابّو کہاں ہیں؟ میں انہی کی عیادت کے خیال سے اس وقت حاضر ہوا ہوں۔ اس نے کمرے میں روزینہ کے ابّو کو نہ دیکھ کر کہا۔

اور یہ سنتے ہی روزینہ اور اس کی امّی سسک سسک کر رو پڑیں۔

چند لمحوں کے بعد روزینہ کی امّی نے اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کل اُن کا انتقال ہو گیا!"

"اوہ! مجھے بے حد افسوس ہے۔ لیکن انہیں ہوا کیا تھا؟"

"بیٹے! انہیں مفلسی کا مہلک روگ لگ گیا تھا جس نے آخر ان کی جان لے لی اور وہ ہمیں بے سہارا چھوڑ کر داغ مفارقت دے گئے۔"

"آپ لوگوں کی گذراوقات کا کیا ذریعہ ہے؟"

"جب تک وہ زندہ تھے کچھ لڑکے پڑھنے کے لئے آجایا کرتے تھے اور ان سے جو کچھ مل جاتا تھا اسی سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔

"اب آپنے کیا سوچا ہے؟"

"اللہ مالک ہے۔ کوئی نہ کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"سر! امی آپ سے چھپا رہی ہیں۔ یہ ضعیف ہیں اور ہمیشہ بیمار رہتی ہیں۔ ان سے کوئی کام نہ ہوگا۔

اب مجھے ہی کوئی کام کرنا پڑے گا۔"

"روزینہ! تم کام کروگی؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم ابھی کمسن اور نادان ہو۔ زمانہ کی ٹھوکریں برداشت

نہ کرسکوگی۔ عجلت سے کام نہ لو۔ میں کل کچھ سوچ کر بتاؤں گا۔"

اور دوسرے دن جب مہینہ بھر کا راشن اور دوسرے ضروری سامان رکشہ پر رکھوا کر وہ روزینہ کے یہاں پہنچا تو اس کی امی

نے حیرت سے کہا ۔

"بیٹے! یہ کیا؟"

"آپ ہی لوگوں کے لئے لایا ہوں۔ اُمید ہے خلوص بھرے اس نذرانے کو ٹھکرا کر آپ میرا دل نہ توڑیں گی۔"

"لیکن اس طرح کتنے دنوں تک چلے گا؟ اس سے تو بہتر یہ ہوگا کہ روزینہ خود کوئی کام کرے یا کوئی نیک اور

مناسب لڑکا اس کا سہارا بن جائے۔"

"امی! آپ عجلت سے کام نہ لیں۔ میں سوچ رہا ہوں۔"

اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور روزینہ اور اُس کی امی چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

ایک دن جب وہ روزینہ کے یہاں پہنچا اس وقت اس کی امی پڑوس میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔

اُس نے روزینہ کو ہنسانے کے خیال سے کہا ۔

"روزینہ! میں نے تمہارے لئے لڑکا دیکھ لیا ہے۔ لیکن وہ ایک ٹانگ سے لنگڑاتا ہے اور ذرا اونچا سنتا ہے!

سر . سا غمزدہ دل میں اتنی گنجائش کہاں کہ کسی خوشی کی تاب لا سکے!"

شٹ اپ! روزینہ، کیا تمہیں ہر وقت سر پہ نظر آتا ہے؟ پاؤں دکھائی نہیں دیتے! آئندہ اگر کبھی تم نے مجھے سر کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!"

اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ اور روزینہ کے لبوں پر ہلکا سا تبسم کھل اٹھا۔

اسی وقت اس کی امی پڑوس سے آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی! روزینہ کے لئے لڑکا مل گیا ہے۔ اب صرف آپ کی منظوری چاہئے۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں نے لڑکی بھی دیکھی ہے اور لڑکا بھی دیکھا ہے۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو 'ہاں' کہہ دیجئے۔"

"بیٹے! مجھے تمہارے اوپر اعتماد نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟ تم جو مناسب سمجھو کرو۔"

روزینہ کی امی نے اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اور جب "چالیسواں" کی رسم کے دسویں دن وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ برات لے کر روزینہ کے یہاں پہنچا تو قدرت کے اس انوکھے کھیل پر روزینہ اور اس کی امی چونک اٹھیں۔

عقد کی رسم بہت سادگی کے ساتھ ادا ہوئی اور وہ جلد ہی دلہن کو رخصت کرا کے اپنے دوستوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دروازے پر کھڑی روزینہ کی امی کو الوداعی سلام کیا اور کار ہوٹل "مون لائٹ" کی جانب روانہ ہو گئی جہاں اس نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔

دوسرے دن کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر وہ اپنی شریک حیات روزینہ کے ہمراہ بمبئی اپنے گھر پہنچ گیا۔ اور ...... اور ...... یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے وہ اپنے والدین کو اپنی شادی کی اطلاع نہ کر سکا تھا۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر وہ شادی سے پہلے روزینہ کو اپنے گھر لے گیا تو

اس کے والدین ہرگز اس اجنبی اور غریب لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کریں گے۔ اور ......

پروفیسر ہاشم کو تصور میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ان کے والد نے چیختے ہوئے کہا ۔

" ہاشم! تمہارا یہ سوچنا غلط ہے کہ تم جوان ہو گئے ہو اور کمانے لگے ہو تو جو چاہو کر سکتے ہو۔ ابھی ہم لوگ زندہ ہیں، مر نہیں گئے۔ اس گھر میں تمہاری من مانی نہیں چلے گی۔"

"ابو جان! مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو دکھ پہنچایا۔ مجھے معاف کر دیجئے اور اس یتیم کے سر پر اپنا دست شفقت رکھ دیجئے۔"

پروفیسر ہاشم نے روزینہ کو اپنے والد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

" ہاشم! اب اور دل نہ جلاؤ اور اس بات کی کوشش کرو کہ اس لڑکی کی صورت میری نگاہوں سے دور رہے۔" انجینیر صاحب نے زہر آلود نگاہوں سے روزینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور ان کے اس برتاؤ پر روزینہ کا دل غم سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔

"اُف! اتنی نفرت!"

اُس نے سوچا اور اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے دو قطرے لرز اٹھے۔

"بہو! تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ان کا غصہ جلدی دُور ہو جائے گا۔"

پروفیسر ہاشم کی امی نے روزینہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اور ساس کے اس نرم برتاؤ کو دیکھ کر اُسے گھنگھور اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن دکھائی دینے لگی۔

انجینیر صاحب کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے باوجود روزینہ نے اُن کا ہر کام مستعدی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ صبح کو سو کر اٹھتے تو برش اور ٹوتھ پیسٹ تپائی پر رکھا ہوا ملتا۔ باتھ روم میں غسل کا پانی موجود ہوتا۔ ان کی عادت تھی کہ ناشتہ سے پہلے اخبار پڑھتے وقت چائے پیا کرتے تھے۔ شام کے علاوہ دن کے دس بجے، دو بجے اور رات کے ۹ بجے بھی انہیں چائے پینے کی عادت تھی۔ روزینہ وقت پر عمدہ چائے بنا کر ان کے سامنے میز پر رکھ آتی۔

وہ اس سے مخاطب ہوتے۔ لیکن جب وہ اٹھ کر باہر جاتے تو چائے کی پیالی خالی ملتی۔ وہ ان کے کپڑے بھی دھو کر بریس کرتی اور قرینے سے ہینگر پر لگا دیتی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ ان کی نفرت کو محبت میں بدل دے۔ لیکن چھ دن گزر گئے اور اس کے کان سسر کی شفقت بھری آواز سننے کے لئے ترستے ہی رہے۔ ساتویں دن جب پروفیسر ہاشم روزینہ کو ساتھ لے کر سلام کرنے اور اجازت لینے کے خیال سے انجینئر صاحب کے پاس پہنچے تو اچانک انہوں نے روزینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو —!؟"

"ابو جان! چھٹی ختم ہو گئی۔ کل کالج جوائن کرنا ہے۔" پروفیسر ہاشم نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن بہو اتنی جلدی نہیں جا سکتی۔ ابھی تو اس کے لئے نہ کپڑے خریدے گئے نہ زیور بنوائے گئے۔ عزیز و اقارب اور دوستوں کو دعوت بھی نہیں دی گئی۔ اور پھر اگر یہ چلی گئی تو مجھے وقت پر چائے بنا کر کون پلائے گا —!؟"

انجینئر صاحب نے روزینہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

اور جو کان سسر کی شفقت بھری آواز سننے کے لئے ترس رہے تھے ان میں پیار کے میٹھے بول شہد کی طرح ٹپک پڑے تو اچانک روزینہ کے سینے سے غم کی بھاری سل ہٹ گئی۔ اس کا دل فرطِ مسرت سے کھل اٹھا۔ غم واندوہ اور مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے اور اس کی دکھ بھری زندگی مسکرا اٹھی!

پرواز ادب، پنجاب

جون، جولائی سنہ ۱۹۸۰ء

سیکشن آفیسر گپتا نے جب یہ سنا کہ برانچ مینجر کھنہ صاحب ہیڈ آفس میں مینجر کی حیثیت سے چارج لینے جا رہے ہیں تو اچانک اُسے زندگی میں کچھ کر گزرنے اور آگے بڑھنے کا سپنا پورا ہوتا دکھائی دیا۔ کھنہ صاحب سے پہلے جو برانچ مینجر تھا اس سے بھی گپتا کے اچھے تعلقات تھے۔ اور جب اس کا ٹرانسفر ہونے لگا تو اس نے لتا کے جڑاؤ کنگن بیچ کر اسے اعلیٰ قسم کا ایک ٹیپ ریکارڈ بھی پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کا پروموشن نہ ہو سکا تھا۔ اسلئے وہ اس بار کسی قیمت پر اس چانس کو مِس نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کھنہ صاحب کے فیئرویل سے پہلے انہیں کوئی ایسا تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا جس کے آگے دوسروں کے تمام تحفے ماند پڑ جائیں اور اس کے لئے پروموشن کی راہ ہموار ہو جائے۔ پھر تو اس کے پاس سب کچھ ہوگا۔ کار، بنگلہ اور بینک بیلنس! اس خیال ہی سے اس پر نشہ سا چھانے لگا۔ لیکن وہ کھنہ صاحب کو کون سا تحفہ پیش کرے، یہ خیال اسے دن رات پریشان کرنے لگا۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ تب مجبور ہو کر اسے لتا سے مشورہ کرنا پڑا۔

"کسی دن گھر پر کھنہ صاحب کی دعوت کر دیجئے۔"

لتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اس کی تجویز پر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے لتا کی پتلی سی کمر تھام کر

اس نازک اندام حسینہ کو اوپر اچھال دیا۔ اور وہ ہنستی ہوئی اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

لتا کے کہنے پر گپتا نے آفس میں فیرویل پارٹی سے ایک دن پہلے کھنہ صاحب کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔

اس دن لتا نے کافی اہتمام کیا تھا۔ بریانی، قورمہ، چانپ اور شامی کباب کے علاوہ اس نے کھنہ صاحب کے لئے سوئٹ ڈشز بھی تیار کئے تھے۔ جب کھانے پینے کا انتظام ہو گیا تو اس نے کپڑے تبدیل کئے اور خوبصورت چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا۔ گلابی ساڑی اور اسی سے میچ کرتے ہوئے بلاؤز میں اس کا شہابی رنگ کھل اٹھا اور گپتا نے بے خودی کے عالم میں اس پیکرِ حسن و شباب کو اپنے مچلتے ہوئے بازوؤں کے حلقے میں لے لینا چاہا۔ لیکن اسی وقت دروازے پر کھنہ صاحب کی کار آ کر رکی اور اس نے آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

اس نے بڑھ کر بہت گرمجوشی سے کھنہ صاحب کا استقبال کیا اور لتا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کے طور پر کہا ___

"میری لائف پارٹنر لتا! انہیں کہانی لکھنے کا بھی شوق ہے۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ جتنی حسین ہیں آپ کی کہانی بھی اتنی ہی حسین ہوتی ہوگی۔"

کھنہ صاحب نے ایک ہی پل میں تکلف کی ساری دیواریں گراتے ہوئے کہا۔ اور اچانک تین جوان قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

گپتا نے کھنہ صاحب کو اپنے ہمراہ لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور لتا کو چائے وغیرہ لانے کے لئے کچن میں بھیج دیا۔ پروگرام اس طرح سیٹ ہوا تھا کہ پہلے چائے اور ناشتے کا دور چلے گا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک خوش گپی ہوگی اور آخر میں کھانا کھایا جائے گا۔

لتا نے چند ہی منٹوں میں ناشتے کا سامان لا کر میز پر سجا دیا۔ مختلف ڈشوں میں مختلف چیزیں تھیں، نمکین بھی اور میٹھی بھی۔ کئی طرح کے پھل بھی تھے۔ ایک خوشنما ٹی پاٹ میں چائے کا پانی بھی تھا۔ کھنہ صاحب نے لتا کے اصرار پر تمام چیزیں چکھیں اور دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

چائے وغیرہ کا دور ختم ہوا تو موجودہ سیاست موضوعِ سخن بن گئی۔ لیکن فوراً ہی کھنہ صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ــــــ

"مجھے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ میں تو لتا جی کی کہانی سننے کے لئے بے چین ہوں۔" اور گپتا کے اصرار پر لتا نے اپنی خوبصورت سی ڈائری کھول کر ایک کہانی سنانی شروع کی۔ لیکن ابھی کہانی آدھی بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ لائٹ چلی گئی اور کھنہ صاحب نے جھنجھلاتے ہوئے کہا ــــــ

"اس لوڈ شیڈنگ نے تو ناک میں دم کر دیا ہے!"

"آج تو کراسن تیل بھی نہیں ملا۔ اب آدھ گھنٹے تک اندھیرے ہی میں رہنا ہوگا۔"

لتا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں جا کر دکان سے موم بتی لے آتا ہوں۔"

گپتا نے معنی خیز انداز میں لتا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ پھر کھنہ صاحب سے معذرت کرتے ہوئے کہا ــــــ

"کھنہ صاحب! معاف کیجئے گا آپ کو اندھیرے میں بیٹھنا پڑا۔ میں موم بتی لے کر آتا ہوں۔ نہ جانے آدھ گھنٹے کے بعد لائٹ آئے گی یا ایک گھنٹہ کے بعد۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو اندھیرے کا عادی ہوں!"

کھنہ صاحب کا قہقہہ گونج اٹھا اور گپتا اٹھ کر دکان سے موم بتی لانے چلا گیا۔

اچانک ڈرائنگ روم میں گہری خاموشی چھا گئی۔ لیکن اس خاموشی میں لتا کو کھنہ صاحب کی تیز چلتی ہوئی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"لتا! کل آفس میں میرا فیئر ویل ہے۔ میں چارج لینے کے لئے پرسوں ہیڈ آفس جا رہا ہوں۔ اگر مسٹر گپتا چاہیں تو میں یہ جگہ ...."

"کھنہ صاحب! یہ تو ان کی دلی آرزو ہے۔ پلیز آپ اس جگہ کے لئے ان کی سفارش کر دیں!"

یہ کہتی ہوئی اچانک لتا اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے کھنہ صاحب کے صوفے پر آ کر بہت بے تکلفی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

اور۔ اور آخر کھنہ صاحب کو گپتا کے لئے سفارش کا وعدہ کرنا ہی پڑا!

فیئرویل کے دوسرے ہی دن کھنہ صاحب چارج لینے کے لئے ہیڈ آفس چلے گئے۔ اور ان کی سفارش پر گپتا کو ان کی جگہ برانچ مینجر بنا دیا گیا۔

دس سال جیسے پر لگا کر اڑ گئے۔

اس عرصے میں گپتا نے ایک کار بھی خرید لی اور بینک بیلنس بھی بڑھا لیا۔ وہ ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا باپ بھی بن گیا۔ لیکن اب اس کے دل میں نہ وہ پہلے جیسی امنگیں ہیں اور نہ ہی بے سوچے سمجھے آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ ایک خلش پھانس بن کر اس کے سینے میں اٹکی ہوئی ہے۔ زندگی میں کار، بنگلہ اور بینک بیلنس کے لئے اسے جو قربانی دینی پڑی اسے یاد کر کے اب بھی اس کی رگوں میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتی ہیں۔ مینجر کی کرسی کسی زہریلے بچھو کی طرح ڈنک مارنے لگتی ہے اور اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

—☼—

فلم ویکلی، کلکتہ

۲۵ جولائی ۱۹۸۰ء

اُس کا ہاتھ

دل و جان سے چاہنے والے شوہر کی اچانک موت سے لیڈی ڈاکٹر نسرین کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس کی ریشمی زلفیں اپنی دلکشی کھو چکی تھیں۔ گلاب کی طرح کھلا ہوا حسین چہرہ مرجھا کر پژمردہ ہو چکا تھا اور آنکھیں اس طرح سوج کر سرخ ہو گئی تھیں جیسے شوہر کے غم میں اس کا دل خون ہو کر آنسوؤں کی شکل میں بہتا رہا ہو۔

پانچ دن اور پانچ راتیں اس نے بہت بے قراری کے عالم میں گزاری تھیں۔ اس کے دل کا چین و سکون لٹ چکا تھا اور زندگی میں اب اس کے لئے کوئی دلکشی باقی نہ رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کے دل کے قرار کے ساتھ ہی اس کے خیالوں کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لیتا گیا تھا۔ وہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتی رہتی۔ اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔ گھر والوں کے بہت اصرار کرنے پر وہ غسل کر کے کپڑے بدل لیتی اور چائے کے دو چار گھونٹ کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ یا ٹوسٹ کھا لیتی۔ زندگی کی گاڑی اسی سست روی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی جب کہ وہ جلد سے جلد اپنے مرے ہوئے شوہر سے مل کر اس سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتی تھی۔ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے وعدے کو بھلا وہ کس طرح بھول سکتی تھی؟

مرنے والے مر کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں' اپنے چاہنے والوں

کو ساری زندگی رلانے اور تڑپانے کے لئے۔

اچانک اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور فریم میں لگی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر کو اس نے بہت بے قراری سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ فرطِ غم سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور اس نے تصویر کو نگاہوں کے سامنے لاکر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ظفر! تم مجھے تنہا چھوڑ کر کس دنیا میں کھو گئے؟ تم نے تو ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر تم نے اپنا وعدہ بھلا دیا اور مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں تمہاری جدائی میں جی تو رہی ہوں مگر یہ زندگی میرے لئے موت سے بدتر ہے۔ بھلا کوئی موج اپنے ساحل سے جدا ہو کر زندہ رہ سکتی ہے؟! میرے ساحل تو تم تھے۔ تمہارے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

وہ بے خودی کے عالم میں بولتی رہی اور اس کا نازک دل خون ہو کر آنکھوں سے بہتا رہا۔

اسی وقت اس کی امی اسے تلاش کرتی ہوئی وہاں آگئیں۔ اور اس نے تصویر کو دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس کا شوہر ایک مشہور سرجن تھا۔ دورانِ تعلیم میڈیکل کالج میں ان کی نگاہوں نے دلوں کا پیغام ایک دوسرے تک پہنچایا تھا۔ شروع میں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے دل کی بات کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ بے تکلفی بڑھتی گئی اور وہ میڈیکل کالج کے باہر بھی ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ گنگا کی بے تاب لہروں، سرسبز پہاڑوں، حسین وادیوں اور تاروں بھرے آسمان کو انہوں نے اپنی پاک محبت کا امین بنایا تھا۔ ان کی پاکیزہ محبت سیپ میں موتی کی طرح پروان چڑھتی رہی اور بادلوں کے دوش پر وقت آہستہ آہستہ پرواز کرتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ سال کا عرصہ اس طرح گزر گیا جیسے خوشبوؤں کا ایک لطیف جھونکا ہو!

ظفر نے اپنے ایک دوست اور نسرین نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے اپنے دلوں کا معاملہ اپنے والدین تک پہنچا دیا۔ ان کے والدین تعلیم یافتہ، مہذب اور باشعور تھے۔ انہیں اس بات کا

یقین تھا کہ دونوں نے ہر پہلو پر غور کر کے ہی ایک دوسرے سے عہد و پیماں کئے ہوں گے۔ اس لئے دو پیار بھرے دلوں کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے بغیر انہوں نے خوشی سے اپنی رضامندی دے دی اور جلد ہی دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنا دئے گئے۔ جس نے بھی اس حسین جوڑے کو دیکھا اس کے منہ سے بے اختیار کلمۂ تحسین نکل گیا۔ اگر نسرین چاند تھی تو ظفر سورج تھا۔ اگر نسرین چمیلی تھی تو ظفر گلاب تھا۔

اگر وہ خوشبو تھی تو وہ اس کا متوالا تھا۔ اگر وہ شاعر کا حسین تصور تھی تو وہ اس میں رنگ بھرنے والا تھا!

ظفر کو پا کر اگر نسرین کو اپنی قسمت پر ناز تھا تو اسے بھی اپنے مقدر پر فخر تھا کہ قدرت نے اسے اتنا حسین تحفہ دیا۔ نسرین کے لئے دن عید اور رات شب برات تھی۔ ظفر اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا اور اس کے معمولی سے اشارے پر بھی اس کی راہ میں ستارے بچھانے کے لئے تیار رہتا تھا۔

ایک دوسرے کی باہنوں میں باہیں ڈالے، ہنستے مسکراتے ایک سال اس طرح بیت گیا کہ اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ظفر کا بازو تھام کر وہ دور تک ساحل کے ریت پر دوڑتی چلی جاتی۔ کبھی پہاڑ کی وادی میں وہ بے خودی کے عالم میں دوڑتی ہوئی آگے نکل جاتی۔ ظفر اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ جاتا اور اس کی باہیں تھام کر اسے اوپر اچھال دیتا۔ اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

نسرین کو جیسے مانگی مراد مل گئی ہو۔ وہ خوشی کا ایک ایک لمحہ اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی تھی کہ اچانک ایک دن اس کی پیار بھری دنیا میں آگ لگ گئی اور اس کا نشیمن جل گیا۔ ظفر کار کے ہولناک ایکسیڈنٹ میں بری طرح زخمی ہو کر دم توڑ چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب اس کی لاش کو گھر لا کر تخت پر لٹا دیا گیا تو وہ اس روح فرسا منظر کی تاب نہ لا سکی اور ایک دردناک چیخ کے ساتھ اس کی لاش پر گر پڑی۔ ہرا بھرا گھر اجڑ کر ماتم کدہ بن گیا۔

پانچ دنوں تک وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ محبوب شوہر کی اچانک موت سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ وہ ہر وقت اسی کی یاد میں کھوئی رہتی۔ اس کے دل کا سونا پن

چکا تھا اور نیند آنکھوں سے اُڑ کر محرومیوں اور مایوسیوں کے اندھیرے میں بھٹکنے لگی - رات کے پچھلے پہر اگر اس کی پلکیں بند بھی ہوتیں تو اچانک اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بند دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی ہو - وہ جلدی سے بستر چھوڑ کر اٹھ جاتی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکتی - لیکن باہر کوئی نہ ہوتا اور وہ دروازہ بند کر کے پھر بستر پر لیٹ جاتی - کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کھڑکی کے نیچے کسی کی دبی دبی سسکیاں گونج رہی ہوں - وہ بے قرار ہو کر اٹھتی اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکتی - لیکن باہر کوئی نہ ہوتا - تو کیا یہ محض اس کا واہمہ تھا؟ وہ سوچتی اور پلنگ پر لیٹ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرتی -

اس کی یہ کیفیت گھر والوں سے چھپی نہ رہ سکی - اس کی امی کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئیں - انہوں نے اس کا غم بھلانے کی بہت کوشش کی اور دعا تعویذ سے بھی کام لیا - لیکن اس کی حالت ویسی ہی رہی - ساری رات اس کے کمرے کی بتی جلتی رہتی - کبھی دروازہ کھول کر اور کبھی کھڑکی کا پردہ سرکا کر وہ باہر جھانکتی اور کبھی بے قراری کے عالم میں کمرے میں چکر کاٹتی رہتی -

انہی دنوں شہر میں ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر آیا ہوا تھا - ایک دن نسرین کے بڑے بھائی عارف نے اسے ساری باتیں بتا دیں اور اپنے ساتھ اسے اپنے گھر لے آیا -

رات کے وقت جب ہوائیں درختوں کی شاخوں پر سسک رہی تھیں، دروازے پر دستک کی آواز سن کر نسرین نے حسب معمول اٹھ کر دروازہ کھول دیا - دوسرے ہی لمحے خلاف معمول اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ چونک اٹھی ـــــ

"آپ ـــــ! آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

اس نے اجنبی کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر کہا -

"میرا خیال ہے کہ میں لیڈی ڈاکٹر نسرین صاحبہ سے مخاطب ہوں!"

اجنبی نے ــــ نسرین کے سوگوار سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا -

"آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن آپ کون ہیں اور آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

نسرین نے کچھ بیزار سے لہجے میں کہا۔

"آپ نے ڈاکٹر قمر کا نام سنا ہوگا۔ مجھے آپ کے بھائی جان نے بتایا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے تو میں انہی کے ساتھ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔"

اجنبی نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

"تھینک یو ڈاکٹر! لیکن مجھے کچھ نہیں ہوا۔ آپ جا سکتے ہیں۔ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔"

نسرین نے ڈاکٹر قمر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہت بے رخی سے کہا۔

ڈاکٹر قمر نے پہلی ملاقات میں اسی کو غنیمت سمجھا اور کاریڈور میں کھڑے ہوئے نسرین کے بھائی سے مل کر آہستہ آہستہ اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔

دوسری رات عین اسوقت جب وہ بے قراری کے عالم میں بالکونی میں ٹہل رہی تھی عارف نے ڈاکٹر قمر کو فون کر کے اُسے اس کی اس کیفیت کی اطلاع کر دی۔ چند ہی منٹوں کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا۔

ہارن کی آواز سن کر عارف نے گیٹ کھول دیا۔ ڈاکٹر قمر کی کار اندر داخل ہو گئی۔ لیکن جب وہ بالکونی میں کھڑی نسرین کے پاس پہنچا تو اسے دیکھ کر وہ اچانک بھڑک اٹھی اور تیز لہجے میں بولی۔

"آپ پھر آگئے؟ آپ کو یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"میں اپنی ڈسپنسری میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے آپ مجھے یاد کر رہی ہیں۔ اور میں حاضر ہو گیا۔"

ڈاکٹر قمر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو کیوں یاد کرنے لگی؟ آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں! بہتر ہوگا کہ آپ آئندہ پھر کبھی یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔"

اس نے ڈاکٹر قمر کے چہرے سے نگاہیں موڑ کر بہت تیکھے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر قمر اس کی اس بے رخی

پر تلملا کر رہ گیا اور آہستہ آہستہ اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔

ایک دن صبح کے وقت دیر تک اس کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا تو اس کے گھر والوں کو بہت حیرت ہوئی۔ اس کی امّی کے بار بار پکارنے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود اس نے آواز دی اور نہ دروازہ کھولا تو انہیں بہت تشویش ہوئی اور وہ رونے لگیں۔ ان کے رونے کی آواز سُن کر عارف بھی آگیا۔ اُس نے فوراً ڈرائیور کو آواز دے کر بلایا۔ اور دونوں بہت مشکل سے دروازہ توڑ کر کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

نسرین اپنے پلنگ پر بے ہوش پڑی تھی۔ عارف یہ دیکھ کر بے چین ہو اٹھا۔ اس نے ڈاکٹر قمر کو فون کر کے اسے فوراً آنے کے لئے کہا اور آہستہ آہستہ نسرین کے منھ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ لیکن جب پانی کے چھینٹے اسے ہوش میں نہ لا سکے تو اچانک عارف کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھا اور بے قرار ہو کر دوبارہ ڈاکٹر قمر کو فون کرنے کے لئے بڑھا۔ اسی وقت ڈاکٹر قمر اپنا بیگ لئے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نسرین کی نازک کلائی پر اپنی کانپتی ہوئی انگلیاں رکھ دیں اور اس کی نبض کی رفتار محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا، پھر اس نے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کو اٹھا کر آنکھوں کی کیفیت محسوس کرنے کی کوشش کی اور بیگ کے اندر سے ایک انجکشن نکال کر اس کے بازو میں لگا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد نسرین کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ موت کے منھ سے نکل آئی تھی۔

ڈاکٹر قمر نے نسخہ لکھ کر عارف کے ہاتھ میں تھما دیا اور میز پر سے اپنا بیگ اٹھا کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"میری جھڑکیوں اور بے رخی کے باوجود اس نے آکر میرا مسیحا ئی کیا
اور مجھے موت کے منھ سے نکال لیا۔ اس کے چہرے پر درد و غم
کی یہ کیسی پرچھائیاں ہیں۔!؟

جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، تو اس کی آنکھیں نیلی کیوں ہوجاتی ہیں؟ کیوں! آخر کیوں۔؟

نسرین نے سوچا اور بے قرار ہو کر پکار اٹھی —

"ڈاکٹر —! آخر آپ چاہتے کیا ہیں!؟"

"میں — میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں تاکہ میں آپ کے غموں کا مکمل علاج کر سکوں!"

یہ کہتا ہوا ڈاکٹر قمر پلٹ کر بالکل اس کے سامنے آگیا۔

اچانک نسرین کو ایسا محسوس ہوا جیسے قمر کی شکل میں ظفر اس کے سامنے کھڑا ہو اور پیار سے اس کا ہاتھ مانگ رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل ایک انوکھے انداز سے دھڑک اٹھا اور اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ ڈاکٹر قمر کی طرف بڑھا دیا!

آکاشن وانی، کلکتہ سے نشر شدہ

۱۳ر ستمبر ۱۹۸۰ء

ایک مرجھائی ہوئی شاخ کی کہانی

گلاب کی وہ شاخ مرجھا کر دم توڑ چکی ہے۔

اس کے ایک کانٹے کی نوک خون سے تر ہے۔ اس کے نیچے تازہ تازہ سرخ خون کے چند قطرے فرش پر جمے ہوئے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ایک خاموش کہانی سنا رہے ہیں!

گلاب کی وہ شاخ سدا سے مرجھائی ہوئی نہ تھی۔ دوسری شاخوں کی طرح وہ بھی سرسبز و شاداب تھی۔ بہار نے دوسری شاخوں کی طرح اس کا رنگ روپ بھی نکھارا تھا اور اس پر بھی شباب پھوٹ پڑا تھا۔ پرندے دوسری شاخوں کی طرح اس پر بھی آتے، ادھر ادھر پھدکتے، دل بہلاتے اور شام ہوتے ہوتے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کر جاتے۔

دوسری شاخیں پرندوں کا لمس محسوس کر کے ایک خاص ادا سے لچک لچک جاتیں اور جھوم جھوم اٹھتیں۔ لیکن وہ اداس اداس سی الجھی الجھی سی اور جھکی جھکی سی رہتی۔ نہ جانے اسے کس کی تلاش تھی؟ نہ جانے اس کا محبوب کون تھا؟

ہر روز نسیم صبح کے لطیف جھونکے گلاب کی تمام شاخوں کو پیار سے گدگداتے اور وہ انگڑائی لے کر رات بھر کی نیند سے بیدار ہو جاتیں۔ پرندے آتے۔ ان شاخوں پر ادھر ادھر پھدکتے اور خوشی

کے گیت گاتے۔ وہ بھی بے دلی سے اس خوشی میں شریک ہو جاتی اور اپنے چاہنے والوں کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ لیکن اچانک ایک دن وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ کمی ہو رہی تھی۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کے تمام چاہنے والے اس سے کترانے لگے۔ اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ وہ ایک موذی مرض میں مبتلا ہو چکی تھی جس نے اس سے اس کا رنگ روپ چھین لیا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی اور وہ مرض اس کی شادابی اور دلکشی کو گھن کی طرح کھاتا رہا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ہر شاخ پر ایک ایک سرخ گلاب کھل اٹھا۔ لیکن اس کی قسمت کا پھول نہ جانے کن اندھیروں میں چھپا ہوا تھا! اپنی ناکام آرزوؤں اور محرومیوں پر وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کی شادابی اور دلکشی ختم ہو گئی اور وہ مرجھا کر بے رونق ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی تلاش نے بھی مایوس ہو کر دم توڑ دیا۔ اور تب ایک دن اچانک ایک بلبل اس اداس اور مرجھاتی ہوئی شاخ کے غم سے متاثر ہو کر اس پر آ بیٹھا۔ اس شاخ نے چونک کر اس سرپھرے بلبل کی طرف اس طرح دیکھا جیسے سوال کر رہی ہو۔

'اب یہاں کیا لینے آئے ہو — !؟'

اس مرجھائی ہوئی شاخ کی اداسی نے بلبل کو بے حد متاثر کیا۔ اس نے اپنے دل میں اس مرجھائی ہوئی غمزدہ شاخ کے لئے بے پناہ ہمدردی محسوس کی اور پیار سے اس کی طرف جھکا۔ زندگی سے مایوس اس شاخ کو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے اسے اسی کی تلاش تھی، جیسے وہی اس کا محبوب تھا جسکے انتظار میں سوکھ کر وہ کانٹا ہو گئی تھی۔ اچانک اس کے خوابیدہ جذبات کھل اٹھے۔ اسی وقت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا آ کر اس سے ٹکرایا اور وہ مچل کر بے اختیار اس بلبل کی طرف جھک گئی۔ بلبل بھی والہانہ انداز میں کبھی اوپر اور کبھی نیچے پھدکنے لگا اور جب وہ شاخ ہوا کے زور سے بار بار اس کی

طرف جھک کر اس سے ٹکرانے لگی تو اچانک وہ اسے چھوڑ کر ایک مخصوص سمت میں پرواز کرنے لگا۔

یہ کھیل کئی دنوں تک جاری رہا۔ بلبل سے ملنے کے لئے وہ غمزدہ شاخ مچلتی اور تڑپتی اور اپنا وجود اس کے وجود میں کھو دینا چاہتی۔ لیکن ہر بار جب وہ مچلتی ہوئی شاخ خود سپردگی کے عالم میں اس کی طرف جھکتی تو وہ اچانک اسے چھوڑ کر ایک مخصوص سمت میں پرواز کرنے لگتا تاکہ جلد سے جلد اپنے گھونسلے تک پہنچ جائے جہاں آنکھوں میں انتظار کی شمع جلائے کوئی اس کی راہ دیکھ رہا ہوتا!

بلبل کے اس رویے نے غمزدہ شاخ کو اس قدر تڑپایا کہ وہ ایک دن جاں بحق ہو گئی۔

نسیم صبح کے لطیف جھونکے جب اس سے ٹکرائے تو سوکھی ہوئی پتیاں جھڑ جھڑ کر نیچے گرنے لگیں۔

اچانک بلبل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اس مرجھائی ہوئی شاخ پر چونچ مارنے کے لئے آہستہ سے جھکا جیسے اس کا آخری بوسہ لینا چاہتا ہو۔ اسی وقت ایک کانٹا نہ جانے کس طرح اس کے جسم سے ٹکرا گیا۔

کانٹے کی نوک خون سے تر ہے۔ تازہ تازہ سرخ خون کے چند قطرے فرش پر جمے ہوئے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ایک خاموش کہانی سنا رہے ہیں!

(غیر مطبوعہ)

عکسِ ماضی